جلد 14 شمارہ 4 مارچ 2012ء ربیع الثانی 1433ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا

اللہ

محبّت

صداقت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیّت

منشور دعوت

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِیُ الأَرُضِ إِلاَّ عَلَی اللّٰهِ رِزُقُهَا وَیَعُلَمُ
مُسُتَقَرَّهَا وَمُسُتَودَعَهَا کُلٌّ فِیُ کِتَابٍ مُّبِیُنٍ

(هود۔6)

ترجمہ

زمین پر کوئی چلنے والا جاندار نہیں مگر اِسکا رزق اللہ کے ذمے ہے۔
وہ اس کے مستقل اور عارضی ٹھکانے کو جانتا ہے۔
سب کچھ کتاب روشن میں ہے۔

ماہنامہ گوجرانوالہ

آدمیت فلاح

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان
کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیاد خواجہ عبدالحکیم انصاری رح
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
Mob: 0300-6493335

مدیر : احمد رضا خان
نائب مدیر : سید رحمت اللہ توحیدی
تقسیم کنندہ : نعمان احمد
0300-6452570
ڈیزائنگ اینڈ کمپوزنگ : شہباز علی برادر محمد رفیق

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ کے لئے

مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سکینڈری بورڈ)
وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
055-4005431

رابطہ مدیر: **0321-6400942**
فیکس نمبر: **+92-55-3736841**
ای میل: **info@toheedia.net**

قیمت شمارہ ——— 30/- روپے
سالانہ فنڈ ——— 300/- روپے

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

اس شمارے میں

درسِ حدیث

مومن کاتحفہ

(مولٰنا شاہ محمد جعفر پھلواروی)

طبرانی نے کبیر میں حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص سے حضورؐ کا ارشاد یوں نقل کیا ہے:

تحفة المومن الموت موت مومن کا تحفہ ہے۔

دنیا کی سب سے بھیانک چیز موت اوراس کا تصور ہے۔ہر شخص پورے یقین کے ساتھ یہ جانتا ہے کہ موت ضرور آ کر رہے گی اوراس سے کسی ذی حیات کا مفر نہیں ۔ایک ملحد، بے دین اور دہریہ خدا کے وجود کا منکر ہونے کے باوجود بھی موت کا منکر نہیں ہوتا ۔انکار خدا کے ساتھ ہی اسے منکرِ آخرت بھی ہونا پڑتا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ خدا کے دیے ہوئے اوامر ونواہی کا تعلق مآل،انجام یا آخرت ہی سے ہے۔منکرِ خدا اپنے آپ کو خدائی اوامر ونواہی کی پابندیوں سے آزاد رکھنا چاہتا ہے اس لیے ان کے عقلی نتائج وانجام سے بھی انکار کر دیتا ہے۔یوں تو وہ دنیا میں ہر عمل کے نتیجے کو دیکھتا اور جانتا ہے لیکن پوری زندگی کے مجموعی نتیجے۔آخرت اور نئی زندگی۔کو بے معنی اور ناممکن سمجھتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ موت کے ساتھ زندگی کے تمام قصے ختم ہو جاتے ہیں اس لیے آگے کچھ نہیں ۔ان تمام باتوں کے باوجود موت کا خوف اس پر بھی طاری رہتا ہے۔خوشی سے مرنا کوئی نہیں چاہتا۔ہر شخص کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس چند روزہ حیات میں جتنا بھر بھی اضافہ ہو جائے بہتر ہے۔کم ہی لوگ ایسے ہیں جو شدید مصائب میں خودکشی کر لیتے ہوں ورنہ انسانی فطرت یہ ہے کہ سخت سے سخت آزمائشوں میں بھی زندگی سے دست بردار ہونے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا اور اُسے ایک طرح کی آس لگی ہوتی ہے کہ شاید آئندہ اچھے دن دیکھنے نصیب ہوں۔اگر یہ آس بالکل ختم ہو جائے جب بھی موت کو بخوشی دعوت دینے پر کوئی آمادہ نہیں ہوتا ۔کیونکہ زندگی سب کو محبوب ہوتی ہے۔اور موت سے سب ڈرتے ہیں۔**یود احدهم لو يعمر الف سنة** ۔(ان میں سے بعض کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ کاش ہزار سال کی زندگی ہو جائے)۔

مرنے والا اگر موت سے خائف نہ بھی ہو تو کم سے کم یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کچھ دنیا کی لذتیں ہوتی ہیں جو اُسے حاصل ہیں یا جن کے حاصل ہونے کی امید ہوتی ہے۔ کچھ احباب، اقربا اور ایک خاص سوسائٹی ہوتی ہے۔ کچھ آرزوئیں ہوتی ہیں جن کو وہ بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ غرض بہت سی چیزیں اس کے سامنے ایسی آتی ہیں جن کے چھوٹنے کا اسے غم ہوتا ہے اور یہ غم اُسے موت کی آغوش میں جانے کی بجائے مزید زندگی کا خواہش مند بنا دیتا ہے۔

غرض یا تو زندگی ختم ہونے کا غم ہوتا ہے یا موت کے آنے کا خوف ہوتا ہے یا دونوں کیفیتیں مخلوط شکل میں ہوتی ہیں اور انسان کچھ اور زندہ رہنا چاہتا ہے۔

موت کا یہ خوف محض اس لیے ہوتا ہے کہ حیات و موت کے متعلق عموماً صحیح تصور قائم نہیں کیا جاتا۔ زندگی باوجود درحقیقت ایک ایسا سکہ ہے جس کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک رُخ وہ ہوتا ہے جسے ہم اس دنیا کی زندگی کہتے ہیں اور دوسرا رُخ وہ ہوتا ہے جو دنیا کی یہ چند روزہ زندگی ختم ہونے بعد شروع ہوتا ہے۔ اسی کا نام تو موت ہے لیکن دراصل یہ زندگی ہی کا دوسرا حصہ ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ اگلا ارتقائی قدم ہوتا ہے۔ جب ایک بچہ جوان ہوتا ہے تو اس کا بچپنا مر جاتا ہے لیکن یہی موت ہے جس کے بعد جوانی کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ زندگی بچپن بھی تھی اور زندگی شباب بھی ہے۔ لیکن یہ زندگی پہلی زندگی ختم ہونے کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ بس یہی صورت یہاں بھی ہے کہ ایک زندگی کی موت کے بعد ہی دوسری زندگی شروع ہوتی ہے۔ پہلی کا نام دنیا اور دوسری کا نام آخرت ہے۔

اس حقیقت کو جو لوگ سمجھ لیتے ہیں انھیں دنیا کی زندگی ختم ہونے کا کوئی غم نہیں ہوتا مگر ہی اُخروی زندگی میں محاسبہ اعمال کا خوف ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک ابتدائی درجہ ہے اور ارتقائے ایمانی کی دلیل ہے۔ لیکن ایک درجہ اس سے بھی بلند تر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مرنے والے کو نہ تو دنیا چھوٹنے کا غم ہوتا ہے نہ اخروی باز پرس کا خوف۔ یہ مقام ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جن کی زندگی کمالِ عبدیت میں گزری ہو اور امید رحمت ان کا سرمایہ حیات بن گئی ہو۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو مرنے سے پہلے ہی اپنا مقام دیکھ لیتے ہیں۔ پھر تو وہ اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے بے

چین ہو جاتے ہیں۔انہیں نہ تو اُخروی باز پرس کا خوف ہوتا ہے نہ دنیا چھوٹنے کا غم۔یہ ہوتے ہیں اللہ کے دوست۔**الا ان اولیاء اللّٰہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون**۔مرنے والے عموماً مرتے وقت **واکـــربـــاہ** (ہائے تکلیف) کہتے ہیں اور یہ عین تقاضائے بشریت ہوتا ہے جو نیک و بد سب کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ایک مقام ایسا بھی ہوتا ہے جہاں پہنچنے کے بعد سیدنا بلالؓ نے مرتے وقت واکرباہ کی بجائے **واطـربـاہ** (مزے ہیں مزے) کہہ کر خوشی کا نعرہ لگایا اور اس اظہارِ مسرت کی وجہ یوں بیان کی کہ:

غداً القی الاحبه، محمدًا وصحبه۔کل میں اپنے پیاروں سے ملوں گا محمدؐ اور ان کے رفقا سے ملوں گا۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے حضورؐ نے یوں ادا فرمایا کہ:

تحفة المومن الموت　　　موت تو مومن کے لیے تحفہ ہے۔

اگر مومن اُخروی باز پرس سے خائف ہو تو یہ خوف بھی اس کے ایمان کی دلیل ہے اور موت اس کے لئے بھی تحفہ ہے۔ایمان کی ایک منزل یہ بھی ہے کہ وہ خوف اور امید کی درمیانی کیفیت میں ہوتا ہے۔بعض اہلِ ایمان کی نزاکتِ احساس اتنی بڑھی ہوئی ہوتی ہے کہ اپنی معمولی لغزشیں بھی سامنے آ جاتی ہیں۔اس وقت اگرچہ رحمتِ الٰہی سے مایوس بالکل نہیں ہوتے مگر بعض لغزشوں کا احساس شدت اختیار کر لیتا ہے اور ان کا دل کچھ دیر خوف و رجا کے درمیان جھولا جھولتا رہتا ہے۔مگر آخر کار وہ بھی مرنے سے پہلے اپنا مقام دیکھ کر خوشی سے مسکرانے لگتے ہیں:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　　چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

بخاری و مسلم، موطا اور نسائی میں ابو قتادہ سے ایک اور ارشادِ نبوی بھی مروی ہے جس کی رو سے مردِ مومن کی موت اس کے لیے تحفہ ہوتی ہے۔اس حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ: برے جب مرتے ہیں تو دنیا کو ان کے شر سے نجات مل جاتی ہے اور جب مومن مرتا ہے تو دنیا کے شر سے اُسے نجات مل جاتی ہے۔پہلے کو "مستراح منہ" کہا گیا ہے اور دوسرے کو مستریح۔مطلب یہ ہے کہ مومن اگر اپنی شدتِ احساس کی وجہ سے خوف و اُمید کی درمیانی کیفیت میں اٹکا ہوا بہ ظاہر وہ اپنا

مقام مرنے سے پہلے نہ بھی دیکھ سکا ہو جب بھی اس کی موت اس کے لیے تحفہ ہی ہوتی ہے۔ اس زیر نظر حدیث میں موت کی ایک ایسی اعلیٰ قدر اور ایسا ارفع تصور دیا گیا ہے جس پر یقین وایمان ہونے کے بعد زندگی اور موت دونوں کی قدریں بدل جاتی ہیں۔(ومحیای ومماتی للّٰہ رب العلمین ٥) تو اس کے لیے اس کی زندگی بھی نعمت ہے اور موت بھی تحفہ ہے۔

انتقال پُر ملال

☆ بڑے دکھ کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ مجلّہ فلاح آدمیت کے کمپوزر محمد رفیق صاحب (رحمٰن کمپیوٹرز اینڈ پرنٹرز والے) گزشتہ ماہ حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے ہیں۔مرحوم مجلّے کے آغاز سے ہی اس سے منسلک تھے اور انتہائی جانفشانی اور خلوص دل سے مجلّے کی طباعت کا کام کرتے تھے۔اور اکثر اوقات مکتبہ توحیدیہ کی کتابوں یا مجلّے کی اشاعت کیلئے انہیں راتوں کو جاگ کر بروقت کام مکمل کرنا پڑا اور انہوں نے انتہائی عزیمت کے ساتھ اپنے فرض کو نبھایا۔انکی 35 سال کی جواں عمری کی موت نے انکے متعلقین کا نا قابل تلافی نقصان کیا ہے۔مرحوم نے پسماندگان میں بوڑھے ماں باپ کے علاوہ دو معصوم بچے بھی چھوڑے ہیں۔اللہ رب العزت سے دُعا ہے۔کہ اللہ تعالیٰ انہیں آخرت میں بلند درجات عطا فرمائے ،انکی حسنات کو بہتر صورت میں قبول فرمائے سیئات کو اپنی رحمت کے صدقے معاف فرمائے اور لواحقین کو انکا بہتر بدل عطا فرمائے۔(آمین)

☆ گکھڑ کے بھائی رانا رفیق صاحب ،واہ کینٹ کے بھائی افتخار اعوان صاحب ،کی والدہ پنڈی کے بھائی اسحٰق صاحب کی زوجہ محترمہ قضائے الٰہی سے وفات پا چکی ہیں۔تمام بھائی مرحومین کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔شکریہ

ایفائے عہد

(پیر خان توحیدی)

ایفائے عہد کے معنی ہیں وعدہ وفا کرنا۔ وعدہ پورا کرنا۔

ایفائے عہد اور وعدہ کا پورا کرنا پسندیدہ اخلاق کی ایک نشانی ہے۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ خصلت معاشرے میں انسان کی کامیابی کے اہم عوامل میں سے ہے۔ اور انسان کی عظمت وقار اور اس کے معاشرتی معیار کی بلندی پر دلالت کرتی ہے۔ قومی ترقی کے لیے بھی ایفائے عہد اتنا ہی ضروری ہے جتنی اور صفاتِ حسنہ۔ ایفائے عہد اسلامی اخلاق میں سب سے بنیادی خصلت ہے اور مسلمان کے ایمان اور حسن اسلام کی صحت پر سب سے زیادہ دلالت کرتی ہے۔ اس لئے احادیث اور قرآنی آیات میں اس خصلت کے اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے اور اس کے علامت ایمان ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو لوگ اس خصلت سے عادی ہوتے ہیں انہیں ڈرایا گیا ہے کہ اس خصلت کے اختیار نہ کرنے کو علامت نفاق قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔

(**یاایھا الذین امنو اوفو بالعقود**) (المائدہ 1) اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے وعدوں کے پاسداری کرو۔ اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ اور فرمایا **وافو بالعھد ان العھد کان مسئولا** (بنی اسرائیل 34) عہد کی پابندی کرو بے شک عہد کے بارے میں تم سے سوال ہوگا یعنی باز پرس ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے۔ (**ایة المنافق ثلاث اذا حدث کذب واذا وعدا خلف واذا اوتمن خان**) منافق کی تین نشانیاں ہیں (1) جب گفتگو کرے تو جھوٹ بولے (2) جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے (3) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ مسلم کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے **وان صام وصلی وزعم انه مسلم** وہ منافق ہی ہے خواہ روزے رکھے نماز پڑھے اور دعویٰ کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی اور حدیث نبوی سے معلوم ہوا کہ وعدہ کوئی ہوائی کلمہ نہیں کہ جسے کوئی انسان محض اپنی زبان سے ادا کرے اور پھر اس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ضروری نہ سمجھے جیسا کہ آج کل بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ مسلمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ وعدہ کرے پھر پورا نہ کرے اللہ تعالیٰ کا فرمان

ہے(**یا ایھا الذین امنو لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند اللّٰہ ان تقولو مالا تفعلون**)الصّف اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ۔وعدہ خلافی اور عہد شکنی بہت بری اور قابلِ نفرت چیز ہے جسے اللہ اپنے مومن بندوں کے لیے ناپسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر مسلمان جب وعدہ کرے تو ضرور پورا کرے۔لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کل ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو اپنا وعدہ وفا کرتے ہوں۔

آدمی کی اسلام میں حسن وخوبی صرف روزہ،نماز،حج اور دیگر عبادات سے ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس کا اثبات انسان کی نفسیات سے ہوتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہوتی ہے یہاں تک کہ اس کی ذات سے بلند اخلاق اور اعلیٰ اقدار کی خوشبو پھوٹنے لگتی ہے وہ اللہ کے حدود کی پاسداری کرتا ہے اس کے اوامر اختیار کرتا ہے اور نواہی سے بچتا ہے اور ہر چیز میں اس کی ہدایت کا خیال رکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ حقیقی اور سچے مسلمان کی زندگی میں جھوٹ۔عہد شکنی۔بے وفائی اور خیانت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کیونکہ یہ اسلامی اخلاق کے منافی ہے۔یہ چیز صرف منافقین کے اخلاق میں پائی جاتی ہے۔اس تلخ حقیقت کو ان تاجروں۔کاریگروں۔ملازموں اور حکومتی ایوانوں میں بیٹھے ہوئے اقتدار کے پجاریوں کو جان لینا چاہیے جو لوگوں سے اپنے کام کو متعین وقت میں پورا کرنے کا وعدہ تو کر لیتے ہیں مگر پھر وعدہ پورا نہیں کرتے بلکہ یہ کہہ دینے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے کہ یہ کوئی قرآنی آیت یا حدیث نہیں جسے پورا کیا جائے۔حیف ہے ایسے لوگوں پر جن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ بھی اللہ ہی کا حکم ہے کہ تم اپنے وعدوں کو پورا کرو۔کل جب یہ لوگ چار فٹ زمین کے اندر جائیں گے تو انہیں اپنے کرتوتوں کا پتہ چل جائے گا۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ جناب خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تعمیر ملت کے محاسن اور معائب اخلاق کے باب میں ایفائے عہد کے بارے میں لکھا ہے کہ قیامت میں اس کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔بعض اوقات وعدہ خلافی کے نتائج بہت ہی برے ہوتے ہیں اور جس شخص سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کو نہ صرف جسمانی اور روحانی ایذا بلکہ طرح طرح کا نقصان بھی پہنچتا ہے بابا جی نے اپنے مشاہدے کا ایک واقعہ یوں لکھا ہے کہ ایک شخص نے محض اس لئے خودکشی کر لی تھی کہ

اس کے ایک دوست نے جو روپیہ اس کو دینے کا وعدہ کیا تھا حسب وعدہ وقت وعدہ پر ادا نہیں کیا۔ باباجی آگے لکھتے ہیں کہ جس قوم کے افراد میں وعدہ خلافی کی عادت عام ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی وعدہ خلافی سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ وعدہ کیا ہی نہ جائے۔ انہی خرابیوں اور نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے باباجی نے تو حیدی بھائیوں کو روپے کے لین دین سے منع کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ تو حیدی بھائی جنہیں آپس میں پیار ومحبت کا درس دیا جاتا ہے وہ دست وگریباں ہوں اور ان کے دلوں میں بجائے پیار ومحبت کے نفرت جنم لینے لگے۔

میں نے آج تک جتنے قرض لینے والے لوگوں کو دیکھا یا جن کے بارے میں میں نے سنا اُن میں بمشکل دو تین فیصد لوگ ایسے ہیں جو وعدے کے مطابق قرض واپس کرتے ہوں باقی ستانوے فیصد لوگ قرض کے معاملہ میں وعدہ شکنی کرتے ہیں جسکی وجہ سے فریقین میں نہ صرف گالی گلوچ ہوتی ہے بلکہ جھگڑے فساد قتل وغارت تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دوستی کی راہیں بند اور دشمنی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی کو قرض نہیں دینا چاہیے۔ قرض دینا بھی صدقہ جاریہ ہے کسی کو اس کی مجبوری میں مدد کرنا بہت بڑا ثواب ہے اللہ تعالیٰ کا بھی حکم ہے کہ جب تم لین دین کرو تو لکھ لیا کرو لکھ لینے سے مراد یہ ہے کہ کتنی رقم ہے اور کب واپس کی جائے گی۔ اب لینے والے کا یہ فرض بنتا ہے کہ وقت مقررہ پر رقم واپس کر کے اپنا وعدہ پورا کرے۔

یہ حقیقت ان لوگوں کے بھی گوش گزار ہو جانی چاہیے جو کسی معاملہ میں معاہدہ کرتے ہیں پھر اسے پورا نہیں کرتے اسی طرح ان لوگوں کو بھی بخوبی واقف ہو جانا چاہیے جنہیں کسی مال کسی راز، کسی میراث یا کسی اور شے کا امین بنایا جاتا ہے۔ مگر پھر وہ لوگ اس میں خیانت کرتے ہیں ان تمام لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ ان کا شمار منافقین کے گروہ میں ہوگا خواہ وہ لوگ کتنے ہی روزے رکھیں نمازیں پڑھیں اور کتنا ہی دعویٰ کریں کہ وہ مسلمان ہیں۔

آخر میں قارئین کی دلچسپی کے لیے ایفائے عہد کا ایک تاریخی واقعہ پیش کرتا ہوں۔

ایک دن فاروقؓ دورکا پُر وقار مگر سادہ دربارِ خلافت سرگرم عدل وانصاف تھا۔ اکابر صحابہ بھی موجود تھے کہ اچانک ایک خوبرو نوجوان کو دو نوجوان پکڑے ہوئے لائے۔ اور فریاد کی یا امیر

المومنینؓ اس ظالم سے ہمارا حق دلوایئے کہ اس نے ہمارے بوڑھے باپ کو مار ڈالا ہے۔حضرت عمرؓ نے اس نوجوان کو دیکھ کر فرمایا ہاں تیرا کیا جواب ہے؟۔نوجوان نے کہا ہاں میں نے طیش میں آ کر ایک پتھر کھینچ مارا جسکی ضرب سے وہ پیر ضعیف مر گیا۔حضرت عمرؓ نے فرمایا چونکہ تو نے جرم کا اعتراف کرلیا ہے لہذا قصاص کا عمل لازمی ہو گیا ہے۔جوان نے سر جھکا کر عرض کی مجھے آپ کا حکم ماننے میں کوئی عذر نہیں لیکن ایک بات کی درخواست ہے کہ میرا ایک چھوٹا نابالغ بھائی ہے جس کے لئے والد مرحوم نے کچھ سونا میرے سپرد کیا تھا کہ جب وہ بالغ ہو تو اُس کے حوالے کر دوں۔میں نے اس سونے کو زمین میں دفن کر دیا تھا جس کا حال میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اگر وہ امانت اُس کو نہ پہنچی تو قیامت کے دن مجھ سے پوچھ ہوگی اس لیے اتنا چاہتا ہوں کہ تین دن کے لیے ضمانت پر چھوڑ دیا جاؤں۔امیر المومنینؓ نے اس کے بارے میں سر جھکا کر غور فرمایا اور پھر ارشاد فرمایا کون تیری ضمانت دیتا ہے کہ تو تین دن کے بعد تکمیل قصاص کے لئے چلا آئے گا۔ اِس نوجوان نے چاروں طرف دیکھا اور حاضرین کے چہروں پر سرسری نظر ڈالی اور جناب ابوذر غفاریؓ کی طرف اشارہ کر کے عرض کیا یہ صاحب میری ضمانت دیں گے۔حضرت عمرؓ نے حضرت ابوذرؓ سے پوچھا کہ کیا تم ضمانت کرتے ہو انہوں نے فرمایا بے شک میں ضمانت کرتا ہوں۔چونکہ یہ ایک جلیل القدر صحابی کی ضمانت تھی۔اس لئے امیر المومنینؓ راضی ہو گئے دونوں مدعی نوجوانوں نے بھی اپنی رضامندی ظاہر کردی اور وہ شخص چھوڑ دیا گیا اب تیسرا دن تھا حضرت عمرؓ کا دربار بدستور قائم ہوا تمام جلیل القدر صحابہؓ جمع ہوئے دونوں مدعی بھی آ گئے حضرت ابوذرؓ بھی تشریف لے آئے اور وقت مقررہ پر مجرم کا انتظار ہونے لگا۔وقت گذرتا جاتا تھا لیکن مجرم کا پتہ نہیں۔صحابہؓ میں ابوذرؓ کی نسبت تشویش ہونے لگی دونوں نوجوانوں نے کہا اے ابوذرؓ ہمارا مجرم کہاں ہے۔ابوذرؓ نے کمال استقلال اور ثابت قدمی سے جواب دیا کہ اگر تیسرے دن کا وقت گزر گیا اور وہ نہ آیا تو خدا کی قسم میں اپنی ضمانت پوری کر دونگا۔عدالت فاروقیؓ بھی جوش میں آئی حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر مجرم نہ آیا تو ابوذرؓ کی نسبت وہی کاروائی کی جائے گی جس کی شریعت اسلامی متقاضی ہوگی۔یہ سن کر صحابہؓ میں تشویش پیدا ہوئی اور بعض صحابہؓ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو

گئے۔مجبور ہو کر لوگوں نے مدعیان ہی کہا کہ تم خون بہا قبول کر لومگر انہوں نے قطعی انکار کیا اور کہا خون کے بدلے خون ہی چاہتے ہیں۔غرض لوگ اِس پریشانی میں تھے کہ نا گہاں پسینے میں ڈوبا ہوا سانس پھولی ہوئی مجرم نمودار ہوا اور آتے ہی حضرت عمرؓ کے سامنے سلام پیش کیا اور کہا کہ آپؓ خدا اور رسول ﷺ کا حکم بجالائیں میں حاضر ہوں۔آپ حضرت ابو ذرؓ نے کہا کہ اے امیر المومنینؓ خدا کی قسم میں جانتا بھی نہیں کہ یہ شخص کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے مگر جب سب کو چھوڑ کر مجھے اس نے ضامن بنایا تو میں انکار نہ کر سکا اور اس کے چہرے نے یقین دلایا کہ یہ اپنے عہد کا سچا ہو گا۔اس لئے ضمانت دے دی۔اِس نوجوان کے آتے ہی حاضرین میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا تھا کہ دونوں مدعی نوجوانوں نے خوشی میں آ کر عرض کیا امیر المومنینؓ ہم نے اپنے باپ کا خون معاف کر دیا سب کی طرف سے ایک نعرہ مسرت بلند ہوا اور حضرت عمر فاروقؓ کا چہرہ بھی چمکنے لگا اور فرمایا مدعی نوجوانوں تمہارے باپ کا خوں بہا میں بیت المال سے ادا کروں گا انہوں نے عرض کیا امیر المومنینؓ ہم اِس حق کو خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے معاف کر چکے ہیں اب ہمیں کچھ لینے کا حق نہیں رہا اور نہ لیں گے یہ ہے ایفائے عہد اور یہ ہے اس کی برکت۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب مسلمانوں کو ایفائے عہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

سالانہ اجتماع

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا سالانہ اجتماع

مورخہ 13,14 اپریل 2012ء بروز جمعۃ المبارک و ہفتہ

''مرکز تعمیر ملت'' گوجرانوالہ میں طے پا چکا ہے۔

سب بھائی تاریخ نوٹ فرمالیں۔

برائے رابطہ!

Ph: 055-4005431, 0300-6493335:

فضیلت قرآن

(مولانا عبدالشکور ترمذی)

حدیث شریف میں ہے کہ روزہ اور قرآن کریم دونوں قیامت کے دن شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا اے رب میں نے اس کو دن میں کھانے پینے سے باز رکھا تھا۔ میری شفاعت اس کے حق میں قبول کیجئے اور قرآن کہے گا میں نے اس کو رات کو جگایا تھا اس لئے میری شفاعت قبول فرمایئے۔ پس دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

ایک اور خاصیت ان دونوں میں مشترک پائی جاتی ہے یعنی تلاوتِ قرآن اور روزہ میں، اور وہ خاصیت قرب خاص حق تعالٰے کا ہے۔ تلاوت میں بھی خاص قرب ہوتا ہے ایسے ہی روزہ دار کو بھی خاص قرب ہوتا ہے۔ حق تعالٰی کا۔ یہ دوسری بات ہے کہ تلاوت میں وجہ قرب اور ہے اور روزہ میں وجہ قرب اور۔ تلاوت سے تو اس لئے قرب خاص ہوتا ہے کہ کلام کو خاص مناسبت ہوتی ہے متکلم سے اور ظاہر ہے کہ جو شخص اس کی تلاوت کرے گا اس کو خاص تعلق ہوگا صاحبِ کلام سے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ دیکھا کہ وہ اس کے دیوان کو پڑھ رہا ہے مصنف کو اس کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہو جائے گا خواہ وہ پڑھنے والا کلام کو سمجھتا بھی نہ ہو جب بھی اس کے ساتھ خاص محبت ہوگی اور اس کی طرف خاص عنایت مبذول ہوگی۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم بغیر سمجھے پڑھنا بھی موجب محبت حق ہے بلکہ ایک طرح اس شخص کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی جو بدوں سمجھے ہوئے اس کے کلام کو پڑھ رہا ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ مضامین سے حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے کلام کی تلاوت کرتا ہو اور مصنف کی محبت تلاوت کا باعث نہ ہوئی ہو بخلاف اس شخص کے جو بدوں سمجھے ہوئے تلاوت کرتا ہو کہ اس کا باعث سوائے محبت مصنف کے اور کچھ نہیں۔

اصل دولت قربِ خداوندی ہے اور وہ کلام اللہ کے سمجھنے پر موقوف نہیں۔ گو سب کے لئے اس کی اجازت نہیں کہ سب کے سب بدوں سمجھے ہوئے پڑھیں بلکہ تھوڑے لوگ ایسے بھی ضرور ہونے چاہئیں کہ خود بھی کلام اللہ کو سمجھتے ہوں اور دوسروں کو بھی سمجھا سکیں اور فضل کلی اس کو سمجھ

کر پڑھنے ہی میں ہے۔ مگر ایک حیثیت سے اس شخص پر حق تعالیٰ کی زیادہ عنایت ہوگی جو بدوں سمجھے ہوئے کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہو۔ کیونکہ صرف حق تعالیٰ کی محبت اس کا باعث ہوسکتی ہے سو کلام اللہ کا اصل نفع اس کے سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ نے حق تعالیٰ سبحانہ وتعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ عرض کیا کہ اے اللہ! وہ کونسا عمل ہے جو آپؐ سے زیادہ قریب کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوا وہ عمل تلاوت قرآن ہے۔ آپ نے عرض کیا۔ بفہم یا بلا فہم کو سمجھ کر یا بلا سمجھے۔ ارشاد ہوا۔ بفہم یا بلا فہم سمجھ کر ہو یا بدوں سمجھے ہو۔ راز اس میں یہ ہے کہ مصنف اپنے کلام کے پڑھنے سے خوش ہوا کرتا ہے۔ پس جب بندہ حق تعالیٰ کے کلام کو پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے۔

تلاوت کی فضیلت کی ایک وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی حق تعالیٰ کے افعال ہیں بندہ کے ویسے ہی افعال حق کی نقل نہیں ہوتے۔ صرف تلاوت ہی ایسا فعل ہے کہ بندے کی تلاوت بالکل نقل ہوتی ہے کلامِ حق کی یعنی جیسے اللہ تعالیٰ کلام کررہے ہیں یہ بھی کلام کررہا ہے۔ مثلاً بندہ کا دیکھنا خدا تعالےٰ کے دیکھنے کی نقل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کا کلام جو پڑھ رہا ہے وہ اس کے صیغوں کو ویسے ہی ادا کررہا ہے جس طرح خدا تعالیٰ کلام فرماتے ہیں۔ مثلاً بندہ نے تلاوت کی **قلنا یانار کونی برداوسلما علی ابراھیم** یا پڑھا **قلنا یاآدم اسکن انت وزوجک الجنۃ** یا اس کو ادا کیا **فجعلنا ھا نکالا لما بین یدیھا وما خلفھا ۔وعلی ھذا القیاس ۔** ہر جز کی تلاوت میں قال اللہ تعالیٰ کا اضافہ نہیں کیا جاتا تو جیسے حق تعالےٰ کلام فرماتے ہیں اسی طرح بندہ بھی کلام کررہا ہے اور تلاوت کا طریقہ بھی اہلِ طریق نے اس طرح تجویز کیا ہے کہ بندہ کے پڑھنے کے وقت یہ تصور کرلے کہ گویا بندہ گراموفون ہے اور متکلم حق سبحانہ وتعالیٰ ہیں کہ اپنے کلام کو حق تعالےٰ نے اس میں بند کردیا ہے اور وہ اس میں سے بلا قصد نکل رہا ہے گویا یہ تجلی کلامی ایسی ہی ہورہی ہے جیسے شجرہ طور پر ہوئی تھی۔ درخت سے آواز آرہی تھی کہ **انی انا اللہ لاالٰہ الا انا** ۔ وہ کلام حقیقت میں شجر کا نہ تھا شجر تو محض واسطہ تھا۔ **متکلم اللہ** تعالےٰ تھے اس طرح بندہ کی آواز سے اللہ تعالےٰ کلام فرمارہے ہیں جس طرح نے یعنی بانسری میں سے آواز نکلتی ہے کہ وہ

حقیقت میں نے کی آواز نہیں بلکہ بجانے والے کی آواز ہے کہ نے میں ہو کر نکل رہی ہے۔

پس تلاوت ایسی چیز ہے کہ اس میں پورا تشبہ ہے بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ اور جس کو کسی سے تشبہ ہو وہ اس کا مقرب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بادشاہ سواری پر نکلتے ہیں تو بعض مصالح سے مصاحبین کو اپنے جیسا لباس پہناتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تلاوت کرنے والے بندوں کو گویا اپنا خاص لباس کلام پہنایا۔ گویا بندے خاص مصاحب ہیں کہ ان کو لباس کلام سے آراستہ فرمایا ہے۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے سینوں میں کلام اللہ ہے۔

کلام اللہ بڑی دولت ہے اس کی بے قدری نہ چاہئے۔ اس کی قدر کرو اور پڑھو خواہ سمجھ کر یا بے سمجھے کیونکہ کلام اللہ کی تلاوت سمجھ کر ہو یا بے سمجھے ہو اس میں خاصیت تشبہ بالحق کی ہے اور یہی خاصیت ہے روزہ کی کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کے ساتھ تشبہ ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی شان ہے نہ کھانا نہ پینا، نہ بی بی رکھنا اور روزہ میں بندہ کی یہی حالت ہوتی ہے۔ روزہ میں ایک صمدیت کی شان ہے۔ لہٰذا دونوں عملوں میں تشبہ بالحق ہوا۔ یعنی تلاوت قرآن میں اور روزہ میں، یہ دونوں عمل رمضان میں ہیں اس لئے دونوں عملوں کو رمضان سے مناسبت ہوئی۔ ایک مناسبت قرآن اور روزہ میں یہ ہے کہ کلام اللہ سے انوار پیدا ہوتے ہیں۔ یہی خاصیت روزہ کی ہے کہ اس سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انوار پیدا ہونے کی وجہ علیحدہ علیحدہ ہو۔ یعنی تلاوت میں اور وجہ ہو اور روزہ میں اور، وہ یہ کہ تلاوت عبادت وجودی ہے اور روزہ عدمی دونوں میں تفاوت ہے مگر نورانیت پیدا کرنے میں مشترک ہیں۔

چنانچہ روزہ سے تو نور اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ کھانے سے قوت بہیمہ میں ترقی ہوتی ہے اور نار شہوت بھڑکتی ہے اور اس کا غلبہ منافی ہے نور کے، اور جب روزہ میں آدمی کھانے پینے سے رکے گا تو نار شہوت میں کمی ہوگی اور اس کمی سے نور میں ترقی ہوگی۔

مگر روزہ کے بعد بھی مادہ شہوت باقی رہتا ہے اور اس کے رہنے میں بھی حکمت ہے کیونکہ نار شہوت کو ایک درجہ میں منافی ہے نور کے۔ مگر بدوں اس کے نورانیت بھی حاصل نہیں ہوتی اگر شہوت نہ ہوتی تو اجر کیسے ملتا کیونکہ نامرد کا زنا سے رکنا کوئی کمال نہیں اور نہ اس کو زنا سے بچنے

پر کچھ ثواب ہے پس اجر کے لئے مادہ شہوت ہونا چاہئے ۔شہوت کی مثال ایسی ہے جیسے حمام میں خس وخاشاک سے آگ جلتی ہو کہ وہ ایک درجہ میں پانی کے لئے ضرر کی چیز ہے مگر پانی کے اندر اس سے حرارت ونورانیت آ گئی ۔اگر آگ نہ ہوتو حرارت ونورانیت کیسے آئے اور یہ نورانیت آئی کیسے؟ یہ آڑ کی وجہ سے آئی کہ پانی اور آگ میں ایک آڑ حائل ہے، یہ آڑ ہی کی برکت ہے کہ پانی میں نورانیت آ گئی ۔اسی طرح نارِ شہوت کوایسی چیز ہے کہ بعض مرتبہ نار شیطانی کی طرف پہنچادیتی ہے ۔لیکن تقویٰ کے آڑ سے اگر اس کی حفاظت کی جائے تو اسی سے نورانیت بھی پیدا ہوتی ہے ۔

شہوت دنیا مثال گلخن است   کہ از وحمام تقوی روشن تر ست

خلاصہ یہ ہے کہ روزہ میں ترک باعث ہے نور کااور تلاوت میں وجود سبب ہے نور کا ۔اس بیان سے یہ شبہ بھی رفع ہو گیا جوبعض نئے خیال کے لوگ کیا کرتے ہیں کہ ایسی حالت میں قرآن پڑھنے کا کیا نفع، جب ہم اس کو سمجھتے ہی نہیں، مگر قرآن پڑھنے میں جوفائدہ ہے اس سے یہ لوگ ناواقف ہیں ۔اُوپر ان بعض فائدوں کا ذکر ہو چکا ہے ۔

علاوہ بریں رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے الفاظ کا اس قدر اہتمام تھا کہ فرشتہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی مشقت اس اندیشہ سے برداشت فرماتے تھے کہ ان محبوب الفاظ میں سے کوئی لفظ میرے حافظہ میں سے نکل نہ جائے ۔یہاں تک کہ حق تعالیٰ کے منع کرنے کی نوبت آئی اور حق تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ کام ہمارے ذمہ ہے کہ قرآن پاک کو آپ (ﷺ) کے دل پر جمادیں گے ۔**لاتحرك به لسانك لتعجل به** الخ ۔

اس تسلی کے بعد حضور ﷺ فرشتے کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے جب حضور ﷺ کو الفاظ قرآن کا اس درجہ اہتمام تھا تو ہم کو بھی ان کا اہتمام کرنا چاہئے کہ بدوں الفاظ کے معانی کی حفاظت نہیں ہوسکتی ۔لہذا معانی کی نگہبانی یہی ہے کہ الفاظ کو یاد کیا جائے ۔جو نوتعلیم یافتہ الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں ۔درحقیقت وہ معانی قرآن کی بھی قدر نہیں کرتے، ورنہ اس کی حفاظت کے ہر سامان کی ان کو قدر ہوتی ۔

صاحبو! الفاظ قرآن کو اس کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے کیونکہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے حفظ ہو جاتے ہیں۔ تم اپنے حفظ پر کیا ناز کرتے ہو ذرا کافیہ یا اور کوئی نظم ونثر کی کتاب تو حفظ کر کے دیکھو آپ کو اس وقت اپنے حفظ کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ یہ خدا تعالیٰ ہی کی تو حفاظت ہے کہ قرآن جیسی ضخیم کتاب کا حفظ کرنا ایسا آسان کر دیا ہے کہ بچے تک حفظ کر لیتے ہیں۔ بلکہ تجربہ شاہد ہے کہ حفظ قرآن بچپن ہی میں اچھا ہوتا ہے۔ بڑے ہو کر ویسا حفظ نہیں ہوتا جیسا بچپن میں ہوتا ہے اور یقیناً بچپن میں بچہ معانی قرآن سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا تو جو لوگ بدوں معانی سمجھے الفاظ قرآن کے پڑھنے کو بیکار کہتے ہیں۔ اب اگر ان لوگوں کو مشورہ پر بچوں کو قرآن نہ پڑھایا جائے تو اس کا انجام یہی ہوگا کہ حفظ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یہ لوگ حق تعالیٰ کا مقابلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کے حافظ پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ یہ محفوظ رہے اور یہ لوگ دنیا سے حفظِ قرآن کو مٹانا چاہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو قرآن کے الفاظ سے اس قدر عشق تھا کہ آپؐ خود تو تلاوت کرتے ہی تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا **علیك اقرأ وعليك انزل** (وکما قال) کیا حضورؐ کو میں سناؤں حالانکہ آپؐ ہی پر تو قرآن اُترا ہے۔ فرمایا ہاں میں دوسرے کی زبان سے سُننا چاہتا ہوں۔ آخر حضور ﷺ نے صحابی سے یہ درخواست کیوں کی؟ حالانکہ سارا قرآن آنحضرت ﷺ کو حفظ تھا اور اس کے معانی بھی آپؐ کے ذہن مبارک میں حاضر تھے۔ صرف اسی لئے کہ قرآن کے الفاظ سے حضور ﷺ کو عشق تھا اور دوسرے سے سننے میں بوجہ یکسوئی کے زیادہ مزہ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ صرف الفاظ قرآن بھی بدوں لحاظ معنی کے مطلوب و مقصود ہیں۔

صاحبو! اس سے بڑھ کر الفاظ قرآن کا نفع اور کیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ قرآن پڑھنے والے کی قرأت کی طرف بہت توجہ فرماتے ہیں اور اس کو نہایت توجہ سے سنتے ہیں اس سے بھی الفاظ کا مقصود ہونا ظاہر ہے کیونکہ قرأت اور استماع الفاظ ہی کے متعلق ہے نہ کہ معانی کے۔

علاوہ ازیں اصل مقصود تمام طاعات سے قربِ حق ہے۔ حق تعالیٰ کے یہاں سے اولاً الفاظ

آئے ہیں اور معانی ان کے تابع ہو کر آئے ہیں پس الفاظ کو اللہ تعالیٰ سے قرب زیادہ ہوا۔ بفرض محال اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر ایسے الفاظ عطا کئے جاتے جن کے معانی بالکل قابل فہم نہ ہوتے تو بھی محبانِ خدا کے رقص کرنے کے لیے یہی بات کافی تھی کہ وہ محبوب کا عطیہ اور اس کا تحفہ ہے۔ کیونکہ محبوب اگر عاشق کو کوئی چیز دے تو اس میں دو لذتیں ہوتی ہیں۔ ایک لذت تو محبوب کے ہاتھ سے ملنے کی ہے۔ دوسری لذت اس چیز کے استعمال کرنے کی پھر عشاق الٰہی کے لئے تو الفاظ قرآن کے واسطے کافی تھے۔ اس لئے کہ وہ عطیہ محبوب ہے اور وہ اولاً بالذات ہم کو ملے ہیں گو ان میں معانی بھی نہ ہوتے۔ مگر معانی کے ساتھ دو لذتیں جمع ہو گئیں تو اب یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ لذت معانی سے لذت الفاظ کو چھوڑ دیا جائے بلکہ دونوں لذتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ اور الفاظ کی لذت اس لئے بہت زیادہ قابلِ لحاظ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اولاً آتے ہیں۔ گویا باعتبار قصد کے معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع ہیں۔

غرض بعض جہات سے الفاظ کو زیادہ قرب ہے اور بعض جہات سے معانی کو زیادہ قرب ہے اور کوئی ایک دوسرے سے مستغنی اور بے پرواہ کرنے والا نہیں۔

الحمدللہ مختلف وجوہ سے اس مسئلہ کو ثابت کر دیا گیا ہے کہ الفاظِ قرآن بدوں فہم معنی کے بھی مطلوب ہیں اور ان کا پڑھنا ہرگز بے کار نہیں۔ اب یہ دعویٰ بالکل باطل ہو گیا کہ بدوں معنی کے الفاظ پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس خیال کے لوگوں نے ایک قرآن صرف اردو ترجمہ کی صورت میں بدوں متن قرآن کے شائع کیا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ اس کا خریدنا حرام و ناجائز ہے۔ کیونکہ اس کا منشاء وہی ہے کہ یہ لوگ الفاظ قرآن کو بیکار سمجھتے ہیں۔

دوسرے اس میں بڑی خرابی یہ ہے کہ اگر یہ صورت شائع ہو گئی تو اندیشہ ہے کہ کبھی یہود و نصاریٰ کی طرح مسلمانوں کے پاس بھی صرف قرآن کا ترجمہ ہی رہ جائے اور اصل غائب ہو جائے۔ جیسا کہ توراۃ و انجیل کے تراجم ہی آج کل دنیا میں رہ گئے ہیں اور اصل کتاب معدوم ہو گئی۔ پھر ترجمہ کے اندر ہر شخص کو آسانی سے تحریف کا موقع مل جائے گا اور جب اصل قرآن بھی ترجمہ کے ساتھ ہو گا تو کسی کی تحریف چل نہیں سکتی۔ کیونکہ اس سے ہر شخص ترجمہ کا مقابلہ کر کے اس

کی صحت وخطا کا موازنہ کرسکتا ہے۔

اس خیال کے بعض لوگوں نے ایک زمانہ میں یہ حرکت بھی شروع کی تھی کہ نماز کے اندر قرآن کا اردو ترجمہ پڑھنے لگے تھے اور دلیل وہی تھی کہ بے سمجھے قرآن پڑھنے سے کیا نفع ہے اس کے چند جواب عقلی اور نقلی اوپر گزر چکے ہیں۔

ایک اور جواب جوان لوگوں کے مذاق کے موافق اور اس خیال کی جماعت پر زیادہ اثر انداز ہوسکتا ہے، ذیل میں تحریر ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ بعض خاصیتیں قرآن مجید کے الفاظ کی ہیں اور بعض خاصیتیں اس کے معانی کی۔ معانی کی خاصیت تو یہ ہے کہ ان کو سمجھ کر پڑھنے سے قرآن کا مطلب معلوم ہوگا اور الفاظ کی خاصیت متکلم کی عظمت وشوکت اور صولت کا استحضار ہے اور یہ صرف قرآن ہی کے الفاظ کے ساتھ خاص ہے، دوسری کسی زبان کو خواہ اس میں کیسا ہی فصیح وبلیغ ترجمہ کردیا جائے ہرگز نصیب نہیں ہوسکتی اور عبادت سے مقصود معبود کی عظمت دل میں پیدا کرنا ہے اور افعال جوارح سے اس عظمت کا ظاہر کرنا ہے نہ کہ صرف استحضار قصص وواقعات۔ پس جو لوگ اردو ترجمہ سے نماز پڑھیں گے ان کے دل میں خداتعالیٰ کی وہ عظمت نماز کے اندر پیدا نہیں ہوگی جو الفاظ قرآن کے ساتھ نماز سے پڑھنے والوں کے دل میں آتی ہے کیونکہ جو لوگ نماز میں ایسی زبان میں قرآن پڑھیں گے جو بندوں کی ایجاد ہے جو یقیناً اصلی کلام الٰہی کے برابر باعظمت وباشوکت نہ ہوگی۔ نیز ان لوگوں کو نماز میں یکسوئی بھی حاصل نہ ہوگی۔ کیونکہ یکسوئی کے لئے استحضار عظمت ضروری ہے اور ترجمہ سے اس درجہ استحضار عظمت نہ ہوگا جو اصل قرآنی الفاظ سے ہوتا ہے۔ غرض محبت وعشق خداوندی کے لحاظ بھی نقل وعقل کے اعتبار سے بھی الفاظ قرآن کے اہتمام کا نہایت ضروری ہونا ثابت ہوگیا۔

پس مسلمانوں کو تعلیم قرآن اور تلاوتِ قرآن کا پابندی کے ساتھ اہتمام کرنا چاہئے اور جب الفاظ قرآن مقصود ہیں تو ان کے صحیح پڑھنے کا بھی اہتمام ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک الفاظ کو صحیح طور پر ادا نہ کیا جائے گا اس وقت تک وہ عربی زبان نہ کہلائے گی۔ اس واسطے شرعاً علم تجوید کا حاصل کرنا ضروری اور واجب ہے۔ حتیٰ کہ علامہ جزری نے فرمایا ہے کہ جو معلم تجوید کے ساتھ نہ

پڑھاتا ہو اس کو تنخواہ لینا جائز نہیں ہے۔(نہایۃ القول المفید) البتہ جو شخص قرآن کے صحیح کرنے کے لئے پوری کوشش میں لگ جائے اور کسی قاری سے حروف کے صحیح کرنے کی مشق شروع کر دے مگر پھر بھی اس کی زبان کے اندر نقص ہونے کی وجہ سے حروف صحیح نہیں ہوئے اور قاری نے کہہ دیا کہ تم سے امید نہیں ہے کہ تمہاری زبان درست ہوگی۔ تو اس وقت وہ معذور ہے اور اس کو اجازت ہے کہ جس طرح بھی وہ پڑھ سکتا ہے پڑھتا رہے اب اس پر غلط پڑھنے کی وجہ سے کوئی مواخذہ نہیں ہے اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہی ثواب دیں گے جو صحیح پڑھنے والوں کو دیا جاتا ہے۔حدیث شریف میں ہے کہ **الماھر بالقران مع السفر الکرام یقرآ القرآن ویتتعتع فیہ وھو علیہ شاق فلہ اجران** (بخاری و مسلم)

''ترجمہ۔قرآن کا ماہران فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو لکھنے والے بزرگ نیکوکار ہیں اور وہ شخص جو قرآن پڑھنے میں اٹکتا ہے اور قرآن کا پڑھنا اس پر مشکل ہوتا ہے اس کے واسطے دوہرا ثواب ہے''

ماہر قرآن سے وہ شخص مراد ہے جس کو قرآن خوب یاد ہو اور پڑھنے میں اس کو دشواری پیش نہ آتی ہو اور فرشتوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کہ لوح محفوظ سے اللہ تعالیٰ کی کتابیں لکھتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ماہر قرآن دنیا میں ان فرشتوں جیسا عمل کرتا ہے کہ بے تکلف قرآن کو فرشتوں کی طرح پڑھتا ہے اور آخرت میں اس کو درجات ملیں گے ان میں وہ فرشتوں کا رفیق ہوگا اور دوہرا ثواب اس میں مشقت اُٹھانے کا ملتا ہے۔اس میں رغبت دلائی ہے اٹک کر پڑھنے والے کو قرآن پاک کی طرف کہ اس طرح پڑھنے میں بھی فضیلت اور ثواب حاصل ہے بلکہ مشقت کے اعتبار سے اس میں زیادہ ثواب ہے۔قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے پر بڑا اجر و ثواب ملتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔**خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ** (بخاری)

ترجمہ! تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن کریم کو سیکھے اور سکھلاوے۔کلام پاک چونکہ دین کی اصل ہے اس کی حفاظت اور بقا پر ہی دین کا مدار ہے اس لئے اس کے سیکھنے اور سکھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا صاحبِ قرآن (مراد حافظِ قرآن ہے) کو کہا جائے گا کہ قرآن پڑھو اور اوپر چڑھ یعنی بہشت کے درجوں پر اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو ٹھہر ٹھہر کر دنیا میں پڑھتا تھا۔ پس تیرا ٹھکانہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر تو پہنچے۔ یعنی قرآن کی ایک ایک آیت پڑھتا جا اور جنت کا ایک ایک درجہ کو اوپر چڑھتا چلا جا۔ ایک روایت میں ہے کہ جنت کے درجات بقدر آیاتِ قرآنیہ کے ہیں۔ پس اگر صاحبِ قرآن تمام قرآن پڑھے گا تو جنت کے اس آخری درجہ پر پہنچ جائے گا جو اس کے حال کے لائق اور مناسب ہو گا۔ گویا ہر آیت قرآن کریم کی جنت کا ایک درجہ ہے۔ جتنی آیتوں کی تلاوت کرے گا اتنے درجے جنت کے کھل جائیں گے۔

ملا علی قاریؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اگر دنیا میں بکثرت تلاوت کرتا رہا تب تو آخرت میں بھی یاد رہے گا ورنہ اس وقت بھول جائے گا اور کچھ نہ پڑھ سکے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمادیں کہ ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو والدین نے اپنے دینی شوق میں قرآن مجید یاد کرادیا تھا مگر وہ اپنی لاپرواہی اور بے توجہی سے دنیا ہی میں اس دولت کو ضائع کر دیتے ہیں۔ اور جو شخص قرآن پاک کے یاد کرنے اور اس میں محنت و مشقت برداشت کرتا ہوا مر جائے بروئے حدیث وہ بھی حفاظ کی جماعت میں شمار کر لیا جائے گا۔

ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جس شخص کو قرآن کریم میری یاد اور مانگنے سے باز رکھے (یعنی جس کو قرآن یاد کرنے اور معانی سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں قرآن کے سوا ذکر اور دعا کا موقع نہیں ملتا) تو میں اسکو مانگنے والو سے بہتر دیتا ہوں۔ اور کلام پاک کی بزرگی تمام کلاموں پر ایسی ہی جیسی اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر۔ (جو شخص قرآن مجید کے ساتھ مشغول ہے اس کی فضیلت ان تمام لوگوں پر ہے جو غیر کلام الٰہی میں مشغول ہیں) رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کی کتاب (قرآن کا) ایک حرف پڑھے اس کے واسطے ہر حرف پر ایک نیکی ہے اور ہر نیکی دس نیکی کے برابر ہے (یعنی ہر حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں (پھر فرمایا) میں یہ نہیں کہتا کہ سارا (الــــم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے اور لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔ یعنی الم کہنے پر تیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ کلام پاک کی تلاوت میں ہر ہر حرف پر ایک ایک

نیکی شمار کی جاتی ہے اور ہر نیکی پر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے دس حصے اجر دینے کا وعدہ ہے اور یہ کم سے کم درجہ ہے اور جس کے لئے چاہتے ہیں اجر زیادہ بڑھا دیتے ہیں ۔ملا علی قاریؒ نا قل ہیں کہ ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ قرآن شریف کو حفظ کیا کرو۔اس لئے کہ حق تعالیٰ شانہ اس قلب کو عذاب نہیں فرمائے گا جس میں کلام پاک محفوظ ہو (از فضائل)۔

جو لوگ حفظ قرآن کو فضول بتاتے ہیں وہ خدارا ذرا ان فضائل پر بھی غور کریں کہ یہی ایک فضیلت ایسی ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو حفظ قرآن پر جان دے دینا چاہئے ۔نیز حضرت علیؓ کی حدیث سے بروایت دیلمی نقل کیا ہے کہ حاملین قرآن یعنی حفاظ اللہ تعالیٰ کے سایہ کے نیچے انبیاء اور برگزیدہ لوگوں کے ساتھ ہوں گے ۔(فضائل) نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزلہ ویران گھر کے ہے اور جو قلب کلام پاک سے خالی ہو اس پر شیطان کا تسلط زیادہ ہوتا ہے ۔اس حدیث شریف میں حفظ کی کس قدر تاکید ہے کہ اس دل کو ویران گھر ارشاد فرمایا جس میں کلام پاک محفوظ نہیں ۔(از فضائل)

تلاوت قرآن پاک سے دلوں کا وہ زنگ بھی دور ہوتا ہے جو کثرت معاصی اور اللہ جل شانہ کی یاد سے غفلت کی وجہ سے دلوں پر لگ جاتا ہے ۔کثرت تلاوت سے دل صاف اور منور ہو جاتے ہیں اور وہ مکانات بھی روشن اور چمکیلے ہو جاتے ہیں جس میں کلام پاک کی تلاوت کی جاتی ہے ۔شرح احیاء میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جن گھروں میں کلام پاک کی تلاوت کی جاتی ہے وہ مکانات آسمان والوں کے لئے ایسے چمکتے ہیں جیسا کہ زمین والوں کے لئے آسمان پر ستارے ،اور حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول خدا ﷺ کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر تلاوتِ کلام اور اس کا دور نہیں کرتی مگر ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے (سکینہ سے مراد ایسی چیز ہے جو جامع ہے ۔طمانیت اور سکون قلب اور رحمتِ خاص کو جو ملائکہ کے ساتھ نازل ہوتی ہے)اور رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے اور ملائکہ رحمت ان کو گھیر لیتے ہیں اور حق تعالیٰ شانہ ان کا ذکر ملائکہ کی مجلس میں فرماتے ہیں ۔

اس حدیث شریف میں قرآن کی مکاتب اور مدرسوں کی خاص فضیلت بیان کی گئی ہے جو

بہت سی انواعِ اکرام کو شامل ہے ان میں ہر ہر اکرام ایسا ہے کہ جس کے حاصل کرنے میں اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر خرچ کردے تب بھی ارزاں ہے، بالخصوص آخری فضیلت آقا کے دربار میں ذکرِ محبوب کی مجلس میں یاد ایک ایسی نعمت ہے جس کا مقابلہ کوئی چیز بھی نہیں کرسکتی (از فضائل)۔

قرآن پاک کی تلاوت کے وقت ملائکہ کے ڈھانپ لینے کا ذکر متعدد روایات میں وارد ہوا ہے۔ اسید بن حضیرؓ کا مفصل واقعہ کتبِ حدیث میں آتا ہے کہ انہوں نے تلاوت کرتے ہوئے اپنے اوپر ایک ابر سا چھایا ہوا محسوس کیا اور اس میں چراغوں کے مانند روشنی دیکھی جب انہوں نے اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ ملائکہ تھے جو تیرا قرآن شریف سننے کے لئے آئے تھے (ملائکہ اژدہام اور کثرت کی وجہ سے ابر سا معلوم ہوتے تھے) اور یہ چراغ کی طرح روشن فرشتوں کے منہ تھے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ میں ضعفاء مہاجرین کی جماعت میں بیٹھا ہوا تھا، ان لوگوں کے پاس کپڑا بھی اتنا نہ تھا کہ جس سے پورا بدن ڈھانپ لیں بعض لوگ بعض کی اوٹ کرتے تھے (مجمع میں ستر کے علاوہ اور بدن کے کھلنے سے بھی حجاب معلوم ہوا کرتا ہے اس لئے ایک دوسرے کے پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ کہ بدن نظر نہ آوے) اور ایک شخص قرآن شریف پڑھ رہا تھا کہ اتنے میں حضورؐ تشریف فرما ہوئے اور بالکل ہمارے قریب کھڑے ہوگئے۔ حضور ﷺ کے آنے پر قاری چپ ہو گیا (یہ خاموشی ادب کی وجہ سے تھی) تو حضور ﷺ نے سلام کیا اور پھر دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا کہ کلام اللہ سن رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے جس نے میری اُمت میں ایسے لوگ پیدا فرمائے کہ مجھے ان میں ٹھہرنے کا حکم کیا گیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ ہمارے بیچ میں بیٹھ گئے تاکہ سب کے برابر رہیں۔ کسی کے قریب کسی سے دور نہ ہوں۔

قرآن شریف پڑھنے کے فضائل تو ہیں ہی بے حد اس کے سننے کے فضائل بھی متعدد روایات میں آئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوگی سید المرسلین ﷺ کو بھی ایسی مجلس میں شرکت کا حکم ہوا ہے، جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ منبر پر تشریف فرما تھے۔ ارشادفرمایا کہ مجھے قرآن شریف سنائیں۔میں نے عرض کیا حضورؐ پر تو خود نازل ہی ہوا ہے، حضورؐ کو کیا سناؤں۔ارشاد ہوا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ دوسرے سے سنوں۔اس کے بعد انہوں نے سورۂ نساء سے سنایا تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

ایک مرتبہ سالم مولیٰ حذیفہؓ کلام مجید پڑھ رہے تھے کہ حضور اکرم ﷺ دیر تک کھڑے ہوئے سنتے رہے۔ابوموسیٰ اشعریؓ کا قرآن شریف سنا تو تعریف فرمائی۔ان روایات سے قرآن مجید سننے کی فضیلت اور ان کا ثواب معلوم ہوتا ہے۔

اوپر کی احادیث وروایات میں قرآن مجید کی تلاوت وسماعت پر جو ثواب بیان فرمایا گیا ہے یہ اس وقت ہے جب نماز سے باہر اور بے وضو قرآن کریم پڑھا سنا جائے لیکن اگر قرآن مجید کی تلاوت نماز میں کی جائے یا وضو کے ساتھ اس کو پڑھا جائے تو پھر قرآن کا ثواب بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔

چنانچہ صاحب احیاء نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے نماز میں کھڑے ہوکر کلام پاک پڑھا۔اس کو ہر حرف پر سو نیکیاں ملیں گی اور جس شخص نے نماز (نفل) میں بلاعذر بیٹھ کر پڑھا اس کے لئے پچاس نیکیاں اور جس نے بغیر نماز کے وضو کے ساتھ پڑھا اس کے لئے پچیس نیکیاں اور جس نے بلا وضو پڑھا اس کے لئے دس نیکیاں اور جو شخص پڑھے نہیں بلکہ پڑھنے والے کی طرف کان لگا کر سنے اس کے لئے بھی ہر حرف کے بدلے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

مسئلہ:۔بعض علماء کا فتویٰ ہے کہ قرآن پاک کا سننا پڑھنے سے زیادہ افضل ہے اس لئے کہ قرآن پاک کا پڑھنا نفل ہے اور سننا فرض ہے اور فرض کا درجہ نفل سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

ف۔قرآن کا پڑھنا نماز کے اندر فرض ہے اور جس قدر بھی طویل قرأت کی جائے گی وہ سب فرض سے ملحق ہوکر اس پر فرض کی ادائیگی کا ثواب ملے گا اس لئے نماز میں قرأت کرنے اور سننے والوں دونوں کو برابر ہر حرف پر سو نیکیاں ملیں گی۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تراویح کے اندر قرآن پاک کا پڑھنا اور اس کا سننا کس قدر ثواب عظیم اور فضیلت رکھتا ہے۔قرآن پاک کا پڑھنا اور سننا جس طرح بہت بڑے اجر وثواب کا کام ہے، اسی طرح قرآن پاک کی تعلیم دینا اور اس کو سکھلانا بھی بہت بڑا کار ثواب اور

فضیلت کا باعث ہے۔

حاکم نے بریدہ رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کو ایک تاج پہنایا جائے گا جو نور سے بنا ہوا ہوگا اور اس کے والدین کو ایسے دو جوڑے پہنائے جائیں گے کہ تمام دنیا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ عرض کریں گے یا اللہ! یہ جوڑے کس صلہ میں ہیں؟ تو ارشاد ہوگا کہ تمہارے بچہ کے قرآن شریف پڑھنے کے عوض میں۔ (از فضائل)

جمع الفوائد میں طبرانی سے منقول ہے کہ حضرت انسؓ نے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے کو ناظرہ قرآن شریف سکھلاوے اس کے سب اگلے اور پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور جو شخص حفظ کرائے اس کو قیامت میں چودھویں رات کے چاند کے مشابہ اُٹھایا جائے گا اور اس کے بیٹے سے کہا جائے گا کہ پڑھنا شروع کر۔ جب بیٹا ایک آیت پڑھے گا۔ باپ کا ایک درجہ بلند کیا جائیگا حتیٰ کہ اسی طرح تمام قرآن شریف پورا ہو۔ (از فضائل)

حضرت معاذ جہنیؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھے اور اس پر عمل کرے اس کے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جاوے گا جس کی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی، اگر وہ آفتاب تمہارے گھروں میں ہو تا پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔ یعنی آفتاب اتنی دور سے اس قدر روشنی پھیلا رہا ہے اگر وہ گھر کے اندر آجائے تو یقیناً بہت زیادہ روشنی اور چمک کا سبب ہوگا تو قرآن شریف پڑھنے پر والدین کو جو تاج پہنایا جائے گا۔ اس کی روشنی اس روشنی سے زیادہ ہوگی جس کو گھر میں طلوع ہونے والا آفتاب پھیلا رہا ہو۔ بچہ کے قرآن شریف پڑھنے پر والدین کے یہ فضائل اور ان کا یہ اجر و ثواب صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ وہ اس کی تعلیم کا سبب بنے اور انہوں نے کوشش کر کے قرآن پاک پڑھانے کے لئے اس کو مکتب و مدرسہ میں بھیجا۔ دنیا کے چار پیسے کے لالچ میں آکر قرآن کی تعلیم سے منہ نہیں موڑا۔ اس کی تعلیم کو بے کار نہیں بتلایا، اضاعت عمر نہیں سمجھا اس کو بے کار دماغ سوزی اور بے نتیجہ عرق ریزی نہیں کہا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

☆☆☆☆☆

مسلم معاشرے کے نمونے

(سید محمد قطبؒ)

جب بھی کبھی مسلم معاشرے کی مکمل اور نمایاں صورت تاریخ کے ہر دور کے لیے بطور نمونہ پیش کرنی ہو تو یہ بالکل طبعی امر ہے کہ یہ مثال نبی کریمﷺ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے پیش کی جائے گی۔

مگر ہم اس مضمون میں خاص طور پر "عوامی اسلام" کو پیش کریں گے۔ اگر یہ تعبیر صحیح ہو۔ وہ اسلام جو ہر فرد کا مطلوب ہو، جس پر ہر شخص قادر ہو اور جس میں لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کے فرق کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ جس میں انسان کے اس طبعی ضعف کا بھی خیال ہو جو انسان کو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے مطابق حصولِ رفعت میں مانع ہو۔ یا اگر یہ رفعت حاصل کر لے تو اس پر برقرار رہنا اس کے لیے مشکل ہو۔

اس مضمون میں ہم نبی کریمﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے نمونے دینے پر اکتفا نہیں کریں گے، باوجود یہ کہ آپؐ کی ذاتِ مبارکہ مسلمانوں کے لیے ہر دور اور ہر زمانے کے لیے قابلِ اقتدا ہے۔ نہ ہم صحابہ کرامؓ کی زندگیوں کے نمونے دینے پر انحصار کریں گے۔ باوجود یہ کہ صحابہ کرامؓ اسلام کا صحیح ترین نمونہ ہیں۔ بلکہ ہم ان عام افراد کی زندگیوں پر بھی اقتصار نہیں کریں گے جو بعض ادوار میں بلندی اور رفعت حاصل کر کے ہمیشہ زندہ رہنے والے ابطال بن جائیں خواہ تاریخ میں ان کے مفصل تذکروں کے بجائے صرف نام ہی نظر آئیں۔

ہم ان تمام مثالوں کے ساتھ مسلم معاشرے میں انسانی ضعف کے نمونے بھی بیان کرنا چاہتے ہیں، اور وہ حالات بھی سامنے لانا چاہتے ہیں جن میں مسلمان مطلوبہ بلندی اور رفعت پر

برقرار نہ رہ سکے۔تا کہ مسلم معاشرے کے تمام حالات اور جملہ شکلوں پر مشتمل واقعی تصویر سامنے آ جائے۔تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ انسانی نفس اور واقعیت کو سامنے رکھتے ہوئے اسلام ایک واقعی نظام ہے۔اور یہ کہ اسلام لوگوں پر ان کی طاقتوں سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور نہ ان میں ایسی دائمی رفعت اور بلندی معین کرتا ہے جو کسی طرح تنزل پذیر نہ ہو سکے۔نہ ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلمان بننے کے لیے بشریت ہی سے کنارہ کش ہو جائیں۔اسلام لوگوں سے برتاؤ ان کے انسان ہونے کی حیثیت میں کرتا ہے۔ان سے اسی قدر مطالبہ کرتا ہے۔جس قدر انسان سے کیا جا سکتا ہے۔

اور تا کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مسلم معاشرے میں لوگوں کی زندگیوں پر طاری ہونے والے ضعف کے ان عارضی لمحات کا اسلام کس طرح مقابلہ کرتا ہے۔جو لمحات دنیا کی جاذبیت اور کشش کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں اور کس طرح اس ضعف کا علاج کرتا ہے تا کہ نفوسِ انسانی از سر نو مطلوبہ معیار تک پہنچ سکیں۔

خیر القرون کی مثالیں:۔

ایک دیہاتی نبی کریمﷺ کے پاس کچھ مانگنے کے لیے آیا۔آپؐ نے اسے دے دیا۔اور فرمایا ''کیا میں نے تیرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا؟'' دیہاتی بولا ''نہیں،آپؐ نے بہترین سلوک نہیں کیا۔'' یہ سنتے ہی مسلمان غصہ میں کھڑے ہو گئے۔آپؐ نے اشارے سے فرمایا کہ ''رک جاؤ''۔پھر آپ گھر میں تشریف لے گئے۔اور دیہاتی کو بلا کر مزید کچھ دیا۔اور اس سے فرمایا ''کیا اب میں نے بہترین سلوک کیا؟'' کہنے لگا ''جی ہاں!اللہ تعالیٰ آپؐ اور آپؐ کے اہل خاندان کو اس کا بدلہ دے؟'' نبی کریمﷺ نے اس سے کہا کہ ''تو نے جو کچھ کہا تھا اس کو میرے صحابہؓ نے محسوس کیا ہے۔اگر تو چاہے تو جو کچھ اب تو نے میرے سامنے کہا ہے وہ ان کے سامنے بھی کہہ

دینا، تا کہ ان کے دلوں سے تیری طرف سے رنجش دور ہو جائے۔" دیہاتی نے کہا "اچھا۔" تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ اس دیہاتی نے جو کچھ کہا تھا، ہم نے اس کو زیادہ دیدیا۔ اب غالباً یہ راضی ہو گیا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے؟" تو دیہاتی نے کہا "جی ہاں! اللہ تعالیٰ آپؐ کے اہلِ خاندان کو اس کا بدلہ دے۔" نبی کریم ﷺ نے فرمایا "میری اور اس دیہاتی کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس کی اونٹنی بدک گئی تھی۔ لوگ اس کے پیچھے دوڑ پڑے تو اونٹنی اور زیادہ دوڑنے لگی تو اونٹنی والے نے کہا۔ تم لوگ چھوڑ دو، میں اپنی اونٹنی کے مزاج سے واقف ہوں۔

چنانچہ اونٹنی کا مالک دور سے چکر لگا کر اونٹنی کے سامنے آیا اور آہستہ آہستہ اسے لا کر باندھ لیا اور اپنا کجاوہ کس کر بیٹھ گیا۔ اگر میں تم لوگوں کو اس دیہاتی کی بات پر چھوڑ دیتا اور تم اسے قتل کر دیتے تو یہ جہنم میں جاتا۔"

احمدؒ، بخاریؒ اور مسلمؒ نے زہریؒ سے روایت کیا ہے۔ ابن شہاب زہریؒ بیان کرتے ہیں۔ کہ مجھ سے عبدالرحمٰنؓ بن عبداللہؓ بن کعبؓ بن مالکؓ نے بیان کیا۔ اور وہ کعبؓ بن مالکؓ کے قائد تھے جب کہ وہ نابینا ہو گئے تھے۔ کہ میں نے کعبؓ بن مالکؓ سے ان کے غزوۂ تبوک سے پیچھے رہ جانے کا واقعہ سنا۔ کعبؓ بیان کرتے ہیں کہ سوائے غزوۂ تبوک پر میرے جانے کا واقعہ یہ ہے کہ اس قدر طاقتور، مالدار کبھی نہیں ہوا تھا جس قدر میں اس جہاد کے موقع پر تھا۔ خدا کی قسم اس جہاد کے موقع پر میرے پاس دو اونٹنیاں تھیں۔ اور نبی کریمؐ جب کسی جنگ پر جاتے اس خاص مہم کی تصریح نہ کرتے۔ لیکن جب تبوک کا زمانہ آیا تو سخت گرمی کا زمانہ تھا ایک لمبا سفر تھا۔ بے آب وگیاہ میدان طے کرنا تھا۔ اور کثیر دشمنوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس لیے آپؐ نے مسلمانوں کے سامنے صورتِ حال واضح کر دی تا کہ جنگ کے لیے تیاری کر لیں۔ اور آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو اپنے ارادے سے آگاہ فرما دیا۔ اور مسلمانوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ کسی رجسٹر میں ان کے نام نہ آ سکتے تھے۔

کعبؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اس جنگ میں شریک نہیں ہونا چاہتے تھے، اور اس سفرِ جہاد

سے کٹی کترا کر بیٹھ رہنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ مجاہدین کی کثرت تعداد کے سبب ان کی غیر حاضری کا پتہ نہ چل سکے گا، تاوقتیکہ خاص ان کے بارے وحی نازل ہو کر یہ نہ بتادے کہ فلاں شخص شریک نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ نے اس جہاد کا اس وقت ارادہ فرمایا جبکہ اور درختوں کے سائے کافی ہو گئے تھے میوے پختہ ہو گئے تھے اور مجھے ان کی طرف میلان تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ اور سب مسلمانوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ اور میں بھی سامان درست کرنے کے لیے صبح کے وقت ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ مگر کسی کام کی تکمیل کیے بغیر واپس چلا آیا کرتا تھا۔ میں اپنے دل میں خیال کرتا تھا، میں جب چاہوں گا یہ کام کرلوں گا۔ اسی لیت ولعل میں کافی دن گزر گئے۔ اور مسلمانوں نے کوشش کر کے سامانِ سفر تیار کر لیا۔ بالآخر ایک صبح کو حضورؐ مسلمانوں کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ مگر میں اپنے سامان کی کوئی شئے درست نہ کر سکا۔ مجاہدین آگے بڑھ گئے اور میں یہ سوچتا رہا کہ تنہا کوچ کر کے ان سے جاملوں گا۔ کاش میں ایسا ہی کر لیتا۔ مگر یہ نہ کر سکا۔ آنحضرت ﷺ کے جانے کے بعد اب جو میں لوگوں میں چلتا تھا، تو مجھے یہ دیکھ کر رنج ہوتا کہ سوائے ان لوگوں کے جن کے منافق ہونے کا خیال تھا، اور علاوہ ان ضعیف اشخاص کے جو کہ اللہ کی طرف سے معذور قرار دیئے گئے تھے، اور کوئی مجھ اپنے جیسا نظر نہیں آتا تھا۔ حضورؐ نے تبوک پہنچنے تک مجھے یاد نہیں فرمایا۔ ایک روز تبوک میں لوگوں کے ساتھ حضورؐ تشریف فرما تھے کہ آپؐ نے فرمایا کعبؓ بن مالک کا کیا ہوا۔ بنی سلمہ کے ایک شخص نے کہا "یارسول اللہؐ اسے اس کی دو چادروں اور اپنے پہلوؤں کی طرف دیکھنے نے روک لیا ہے۔ (یعنی سستی اور آسائش) معاذ بن جبل بولے۔" یہ بات تم نے کچھ اچھی نہیں کہی۔ یارسول اللہؐ! ہم تو سوائے خیر کے اس کے اندر اور کچھ نہیں پاتے۔

رسول ﷺ خاموش رہے۔

کعبؓ بن مالک کہتے ہیں کہ جب مجھے اطلاع ملی کہ حضورؐ تبوک سے واپس آرہے ہیں تو اندرونی رنج والم اور زیادہ ہو گیا۔ اور میں کوئی بات بنانے کی فکر کرنے لگا۔ اور ایسی بات سوچنے لگا

جس سے حضورؐ کی ناراضگی سے نجات مل جائے۔ گھر والوں میں جو لوگ اہلِ رائے تھے۔ اُن سے بھی مشورہ کیا۔ پھر مجھے اطلاع ملی کہ حضورؐ عنقریب ہی آنے والے ہیں۔ مجھے کسی حیلہ سے اپنی نجات کی کوئی سبیل نظر نہیں آئی تو دروغ گوئی کا خیال جاتا رہا۔ اور میں نے سچ بولنے کا پختہ ارادہ کرلیا۔ صبح کو رسول اللہؐ تشریف لے آئے۔ آپؐ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب کبھی آپؐ سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں آ کر دو رکعت نماز پڑھتے۔ پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہوکر بیٹھتے۔ حسبِ معمول حضورؐ نے ایسا ہی کیا۔ تو جو لوگ تبوک جانے سے رہ گئے تھے، انہوں نے عذر خواہی شروع کی اور قسمیں کھانے لگے۔ سب آدمی کچھ اوپر اسی تھے۔ حضورؐ نے سب کی ظاہری حالت دیکھ کر عذر قبول فرمالیا۔ ان سے بیعت لی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی اور باطن کو خدا کے حوالے کیا۔ بالآخر میں حاضر ہوا۔ اور سلام کیا آپؐ نے تبسم فرمایا۔ آپؐ کا یہ تبسم غصہ کی حالت والا تبسم تھا۔ پھر فرمایا ''آؤ'' میں جا کر سامنے بیٹھ گیا۔ فرمایا ''تمہارے رہ جانے کی کیا وجہ ہے۔ کیا تم نے سواری نہیں خریدی تھی۔''

میں نے عرض کیا ''یا رسول اللہؐ! میں اگر کسی دنیادار، آدمی کے پاس بیٹھا ہوتا اور مجھے معلوم ہوتا کہ کوئی عذر کر کے اس کی ناراضگی سے نجات مل سکتی ہے تو مجھے چرب بیانی حاصل ہے۔ لیکن بخدا میں خوب جانتا ہوں کہ اگر میں آپؐ سے جھوٹ بولوں گا اور آپؐ راضی بھی ہوجائیں گے تب بھی عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کردے گا۔ اور اگر سچ بولوں گا اور آپؐ ناراض بھی ہوجائیں گے تو بھی اللہ تعالیٰ سے اچھے انجام کی امید ہے۔ بخدا مجھے کوئی عذر نہیں تھا۔ خدا کی قسم اس جہاد سے بڑھ کر میں کبھی صاحبِ استطاعت اور خوش حال نہیں ہوا تھا۔'' آپؐ نے فرمایا ''اس شخص نے سچ کہہ دیا۔ اٹھ جاؤ، تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق خود کوئی فیصلہ نہ فرمادے۔ قبیلہ بنی سلمہ کے کچھ لوگ بھی اٹھ کر میرے پیچھے آئے اور کہنے لگے بخدا اس سے قبل ہماری دانست میں تم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ پھر اب تم کیوں رسول اللہؐ کے سامنے اس طرح عذر پیش نہ کرسکے جیسا کہ دوسرے رہ جانیوالوں نے پیش کیے۔ تمہارے قصور کے لیے حضورؐ کی دعاء ومغفرت کافی ہوجاتی۔ ان لوگوں نے مجھے اتنی ملامت کی کہ میرا ارادہ ہوگیا کہ آپؐ کے پاس

جاکر اپنے پہلے قول کی تردید کردوں۔مگر میں نے ان سے پوچھا کیا میرے جیسا معاملہ کسی اور کو بھی پیش آیا ہے۔انہوں نے کہاہاں دو آدمی اور بھی ہیں جنہوں نے وہی بات کہی ہے جو تم نے کہی۔اور ان سے بھی رسول اللہؐ نے وہی فرمایا جو تم سے فرمایا۔میں نے کہا وہ دونوں کون ہیں۔ان لوگوں نے کہا ایک مرارہ بن الربیعؓ ہیں اور دوسرے بلال بن امیہ واقفیؓ ہیں۔جب انہوں نے ایسے نیک آدمیوں کا نام لیا جو جنگِ بدر میں شریک تھے۔اور بہت خوبیوں والے تھے تو میں اپنے خیال پر قائم رہا۔پھر حضرت کعب بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے تبوک کی مہم سے غیر حاضر ہو جانے والے دوسرے افراد کو نظر انداز کر کے صرف ہم تینوں سے مسلمانوں کو گفتگو کرنے کی ممانعت فرمادی۔مسلمان ہم سے بچنے لگے اور ہمارے لیے بالکل بیگانے ہو گئے۔اور دوسرے لوگ گھروں میں بیٹھے روتے رہتے۔مگر میں نوجوان تھا اور طاقتور بھی۔باہر نکلا کرتا اور نمازوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوتا۔بازاروں میں چکر لگاتا۔مگر کوئی مجھ سے بات نہ کرتا میں نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔اور نماز کے بعد جب آپؐ اپنی جگہ تشریف فرما ہوتے تو میں سلام کرتا اور دل میں کہتا معلوم نہیں سلام کے جواب کے لیے آپؐ نے لبِ مبارک ہلائے یا نہیں؟ پھر میں آپؐ ہی کے قریب نماز پڑھنا شروع کرتا اور نظریں چرا کر دیکھتا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا ہوں تو آپؐ اپنا رخ پھیر لیتے ہیں۔الغرض جب مسلمانوں کی کنارہ کشی زیادہ بڑھ گئی تو ایک روز میں جا کر ابو قتادہؓ کے گھر کی دیوار پر چڑھ گیا۔وہ میرے چچازاد بھائی تھے اور مجھے ان سے بڑی محبت تھی۔میں نے انہیں سلام کیا۔مگر بخدا انہوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔میں نے کہا ابو قتادہؓ میں تمہیں خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تمہیں اس بات کا علم نہیں کہ مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے۔مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔میں نے دوبارہ قسم دی پھر بھی خاموش رہے۔جب میں نے تیسری مرتبہ قسم دی تو کہنے لگے اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ جانتے ہیں۔میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔میں دیوار سے اُترا اور لوٹ آیا۔

ایک دن میں مدینہ کے بازار میں پھر رہا تھا کہ شام کا رہنے والا نبطی جو مدینہ میں غلہ فروخت کرنے لایا تھا۔لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ کوئی کعب بن مالکؓ کا پتہ بتا دے لوگوں نے میری

طرف اشارہ کیا۔وہ میرے پاس آیا اور شاہ غسان کا ایک خط میرے نام کا لا کر مجھے دیا۔میں چونکہ پڑھا لکھا تھا۔اس خط کا مضمون یہ تھا۔مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی (نبی کریمؐ) نے تم پر ظلم کیا ہے۔خدا نے تمہیں ذلت کی جگہ اور حق تلفی کے مقام پر رہنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔تم ہمارے پاس چلے آؤ،ہم تمہاری دلجوئی کریں گے۔خط پڑھ کر میں نے کہا یہ بھی میرے لیے ایک ابتلا ہے۔پھر میں نے اس خط کو تنور میں جھونک دیا۔جب پچاس دن میں سے چالیس دن گزر گئے تو ایک روز حضورؐ کا قاصد میرے پاس آیا اور کہا کہ حضورؐ نے تمہیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا ہے،میں کہا طلاق دیدوں یا کیا کروں؟ قاصد نے کہا نہیں تم اس سے علیحدہ رہو اور قربت نہ کرو۔حضورؐ نے میرے دونوں شرکاء کو بھی یہی حکم پہنچا دیا۔میں نے اپنی بیوی سے کہا اپنے میکہ چلی جاؤ اور اس وقت تک وہیں رہو جب تک اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ نہ فرما دے۔بلال بن امیہؓ کی بیوی نے رسول اللہؐ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ بلال بن امیہؓ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور اپنا کام خود نہیں کر سکتے،اور نہ ہی ان کے پاس کوئی خادم ہے۔اگر میں ان کی خدمت کروں تو کیا آپؐ کی مرضی کے خلاف ہوگا؟ فرمایا ''نہیں مگر وہ تم سے قربت نہ کریں۔'' انہوں نے کہا ''بخدا انہیں تو اس چیز کی رغبت ہی نہیں،اور خدا کی قسم جس دن سے یہ واقعہ ہوا ہے۔وہ برابر رو رہے ہیں۔'' میرے گھر والوں نے بھی مجھ سے کہا کہ اگر تم بھی اپنی بیوی کے لیے اجازت لے لو جس طرح بلال کی بیوی کو اجازت ملی ہے۔میں نے کہا میں رسول اللہؐ سے ان چیز کی درخواست نہیں کروں گا۔معلوم نہیں آپؐ کیا جواب دیں جبکہ میں جوان بھی ہوں۔

اس طرح دس راتیں گزر گئیں۔جس وقت سے مجھ سے کلام کرنے کی ممانعت ہوئی تھی۔اس وقت سے جب پچاس راتیں پوری ہو گئیں۔اور پچاسویں رات کی صبح کو میں اپنے گھر ہی میں صبح کی نماز پڑھ کر اس حالت میں بیٹھا تھا۔جس کا خدا نے ہمارے حق میں تذکرہ کیا ہے۔میری طبیعت بے چین تھی اور زمین باوجود کشادگی کے مجھ پر تنگ تھی کہ اچانک مجھے ایک منادی کی آواز سنائی دی جو کہ کوہ سلع پر انتہائی بلند آواز سے کہہ رہا تھا کہ ''اے کعب بن مالکؓ بشارت ہو''،میں سجدے میں گر پڑا۔اور جان گیا کہ کشائش کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔نماز فجر کے بعد رسول اللہؐ

نے صحابہ کرامؓ کو ہماری توبہ قبول ہوجانے کی اطلاع دیدی تھی اور لوگ ہمیں خوشخبری دینے کے لیے چلدیئے تھے۔ کچھ لوگ میرے دونوں ساتھیوں کو خوشخبری دینے کے لیے گئے تھے۔ اور ایک آدمی گھوڑے کو ایڑ لگا کر میری طرف چل دیا تھا۔ لیکن قبیلہ اسلم کا ایک شخص دوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور گھوڑ سوار کے پہنچنے سے پہلے میرے کانوں میں اس کی بشارت دینے کی آواز پہنچ چکی تھی۔ غرض جب وہ شخص میرے پاس آیا جس کی بشارت کی آواز میں نے سنی تھی تو میں نے اپنے کپڑے اتار کر اسے پہنا دیئے بخدا اس روز میرے پاس ان دو کپڑوں کے علاوہ اور کوئی کپڑا نہیں تھا اور خود عاریۃً دو کپڑے مانگ کر پہن لیے اور حضورؐ کی خدمت گرامی میں حاضری کے ارادہ سے چل دیا۔ راستہ میں گروہ در گروہ لوگ مجھ سے ملتے اور توبہ کے قبول ہونے پر مبارکباد دیتے اور کہتے مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول فرمائی۔ بالآخر میں مسجد میں داخل ہوا۔ رسول اللہؐ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اور صحابہ کرامؓ حلقہ بنائے بیٹھے تھے۔ طلحہ بن عبیدؓ لپک کر آئے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد دی۔ خدا کی قسم طلحہؓ کے علاوہ مہاجرین میں سے کوئی نہ اٹھا۔ اور کعبؓ طلحہؓ کے اس جذبہ کو فراموش نہ کر سکے۔

کعبؓ کہتے ہیں کہ جب میں نے رسول اللہؐ کو سلام کیا تو چہرہ مبارک خوشی سے دمک رہا تھا۔ فرمایا "روزِ پیدائش سے لے کر آج تک جتنے دن تم پر گزرے ہیں۔ ان میں سب سے بہترین دن کی بشارت ہو۔" میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! یہ معافی آپؐ کی جانب سے ہے یا اللہ کی طرف سے۔ فرمایا اللہ کی طرف سے۔ خوشی کے وقت نبی کریم ﷺ کا چہرہ مبارک دمک اٹھتا۔ گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔

اسی سے ہم آپؐ کی مسرت معلوم کر لیتے تھے۔ الغرض جب میں آپؐ کے سامنے جا کر بیٹھا تو عرض کیا یا رسول اللہؐ میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ اپنے کُل مال سے دستبردار ہو جاؤں۔ اور خدا اور اس کے رسولؐ کی خدمت میں بطور صدقہ پیش کر دوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کچھ مال اپنے پاس رکھو، یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا میں اپنا وہ حصہ روک لیتا ہوں جو خیبر میں ہے۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ اللہ نے مجھے سچائی کی بدولت نجات دی ہے۔ اب

میری توبہ کی تکمیل یہ ہے کہ جب تک جان میں جان ہے صدق کا دامن نہ چھوڑوں۔

حضرت کعبؓ کہتے ہیں بخدا جب سے میں نے یہ بات حضورؐ سے عرض کی ہے میری دانست میں سچائی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کی ایسی آزمائش نہیں کی جیسی کہ میری کی، اور بخدا اس وقت سے لے کر آج تک میں جھوٹ نہیں بولا اور آئندہ کے لیے بھی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ جھوٹ سے محفوظ رکھے گا۔

ابن اسحٰق غزوہ بنی المصطلق کے بارے میں اپنی روایت میں کہتے ہیں جو ۶ھ میں مریسیع پر ہوئی تھی۔ جب رسول اللہؐ اس غزوہ کے بعد "مریسیع" کے چشمہ پر پہنچے تو لوگوں کی ایک جماعت پانی پر آئی۔ اس میں حضرت عمرؓ کا ایک اجیر جہجاہ بن مسعود بھی تھا جو بنی غفار کے قبیلہ کا تھا، اور اپنے گھوڑے کو لیے آ رہا تھا۔ جہجا اور سنان بن وبر جہنی جو بنی عوف بن خزرج کا حلیف تھا۔ یہ دونوں پانی پر لپکے اور لڑائی ہوگئی۔ جہنی پکارا اے معشرِ انصار!" اور جہجا "اے جماعتِ مہاجرین"! یہ سن کر عبداللہ بن اُبَی بن سلول غصہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ کچھ لوگ اس کی قوم کے بھی تھے۔ جن میں زید بن ارقمؓ بھی تھے جو اس وقت لڑکے ہی تھے۔ تو عبداللہ بن ابی بن سلول بولا تم لوگ کیا کر گزرے ہو؟ انہوں (مہاجرین) نے ہمارے درمیان نفرت پھیلا دی۔ اور یہ خود ہمارے شہر میں بکثرت ہو گئے ہماری اور قریش کے ان مفروروں (منافقین مہاجرین کو کہا کرتے تھے) کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں! خدا کی قسم جب ہم مدینہ جائیں گے تو ہم میں سے باعزت ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔ پھر وہ اپنی قوم کے لوگوں سے کہنے لگا۔ کیا دھرا سب تمہارا ہی ہے۔ تم نے اپنے ملک میں انہیں (مہاجرین کو) گھسنے دیا۔ اور اپنے مال بھی ان لوگوں میں تقسیم کر دیئے۔ اگر تم اس وقت ان کی مدد نہ کرتے تو کہیں اور چلے جاتے۔

یہ سب باتیں زید بن ارقمؓ نے سن لیں۔ اور نبی کریم ﷺ کو آپؐ کے دشمن کی باتیں پہنچا دیں۔ آپؐ کے پاس حضرت عمرؓ بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ عباد بن بشرؓ کو حکم دیجئے کہ اسے قتل کر دے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ "نہیں، اے عمرؓ! یہ لوگ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہے ہیں۔ مگر اب یہاں سے کوچ کا حکم دو۔" نبی کریمؐ نے یہ بات جس وقت

فرمائی اس وقت آپؐ عام طور پر کوچ نہیں کیا کرتے تھے۔خیر آپؐ نے حکم دیا اور لوگ روانہ ہوئے۔جب عبداللہ بن ابی ابن سلول کو یہ معلوم ہوا کہ زید بن ارقمؓ اس کی باتیں نبی کریم ﷺ تک پہنچا چکے ہیں تو وہ نبی کریمؐ کے پاس آیا۔اور اس نے قسمیں کھائیں کہ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔اور چونکہ وہ اپنی قوم میں معزز تھا تو رسول اللہؐ کے پاس جو انصار صحابہ موجود تھے وہ کہنے لگے۔یا رسول اللہؐ ہوسکتا ہے اس لڑکے (زید بن ارقمؓ) کو بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو،اور جو ابن سلول نے کہا وہ بات اس لڑکے کو یاد نہ رہی ہو۔(یہ بات ابن سلول کی مدافعت کے لیے کہی گئی)ابن اسحٰق کہتے ہیں جب رسول اللہؐ روانہ ہوئے تو اسید بن حضیرؓ آپؐ سے آ کر ملے۔اور سلام کے بعد کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسولؐ آپؐ ناوقت کیوں روانہ ہوگئے۔اس وقت تو آپ کوچ نہیں کیا کرتے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا تمہارے ساتھی نے جو بات کہی ہے،وہ تمہیں معلوم ہوگئی؟اسیدؓ نے پوچھا کونسا ساتھی؟فرمایا عبداللہ بن ابی۔اسیدؓ نے پوچھا اس نے کیا کہا ہے؟آپؐ نے فرمایا وہ کہتا ہے کہ مدینہ جا کر باعزت ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔اسیدؓ کہنے لگے یا رسول اللہؐ اگر آپؐ چاہیں تو اسے نکال دیجیے گا۔خدا کی قسم وہ ذلیل ہے اور آپؐ باعزت ہیں۔مگر آپؐ اس سے نرمی ہی برتیں۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمارے یہاں (مدینہ میں) بھیجا جبکہ اس کی قوم کے لوگ اس کے لیے موتیوں کا تاج بنا رہے تھے۔لہٰذا وہ (عبداللہ ابن ابی) سمجھ رہا ہے کہ آپؐ نے بادشاہت اس سے چھین لی ہے۔

رسول اللہؐ رات تک چلتے رہے۔پھر صبح تک ساری رات چلے۔حتیٰ کہ دن نکل آیا اور سورج بلند ہوگیا۔تو آپؐ نے پڑاؤ کیا۔لوگوں کا زمین پر لیٹنا تھا کہ سب سوگئے۔رسول اللہؐ نے ایسا اس لیے کیا تھا تاکہ عبداللہ بن ابی کی گذشتہ دن کی کہی ہوئی باتوں سے صحابہؓ کی توجہ ہٹ جائے۔

ابن اسحٰق کہتے ہیں،اسی اثناء میں ابن ابی اور اس کے ساتھی منافقین کے بارے میں سورہ المنافقون نازل ہوگئی۔جب یہ سورت نازل ہوئی تو رسول اللہؐ نے زید بن ارقمؓ کا کان پکڑ کر کہا ''یہ ہے وہ جس نے اللہ کے لیے اپنے کانوں سے صحیح مصرف لیا۔''

اس کے بعد عبداللہ بن ابی کے بیٹے عبداللہ کو بھی اپنے باپ کے بارے میں ساری خبریں مل گئیں۔

ابن اسحٰقؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے عاصم بن عمر بن قتادہؓ نے بیان کیا کہ عبداللہؓ رسول اللہؐ کے پاس آئے اور کہنے لگے یارسول اللہؐ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپؐ عبداللہ بن ابی کو اس کی حرکات پر قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر آپ ایسا ہی چاہتے ہیں تو مجھے حکم دیں۔ میں اس کا سر آپؐ کے سامنے لاکر پیش کیے دیتا ہوں۔ خدا کی قسم خزرج کو معلوم ہے کہ اس قبیلہ میں مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ سے بہتر سلوک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ مجھے خطرہ ہے اگر آپؐ کسی اور کو قتل کا حکم دیں گے، تو میں اپنے باپ کے قاتل کو لوگوں کے درمیان چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکوں گا، اور اسے قتل کردوں گا۔ اور کافر کے بدلے مومن کو قتل کر کے جہنم رسید ہو جاؤں گا۔ رسول اللہؐ نے فرمایا ہم اسے قتل نہیں کریں گے، بلکہ جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے، نرمی اور حُسنِ سلوک سے کام لیں گے۔

اس واقعہ کے بعد سے جب بھی کوئی بات ہوتی تو خود عبداللہ بن ابی کی قوم اس سے مواخذہ کرتی، اور سخت برتاؤ کرتی۔ جب نبی کریمؐ کو یہ خبریں پہنچیں تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ کیا خیال ہے عمرؓ! اگر ابن ابی کو اسی وقت قتل کر دیا جاتا جب تم اس کو قتل کرنے کو کہہ رہے تھے تو ہمارے صحابہؓ کو نقصان اٹھانا پڑتا۔ لیکن اگر آج میں اسی کی قوم کو اس کے قتل کے لیے کہوں تو وہ خود قتل کردیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ رسول اللہؐ کا فیصلہ میرے فیصلے سے زیادہ برکت والا ہے۔

عکرمہؓ بن زیدؓ وغیرہ بیان کرتے ہیں کہ لوگ جب مدینہ واپس پلٹے تو ابن ابی کے صاحبزادے عبداللہ تلوار نکال کر شہر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اور لوگ گزرنے لگے۔ جب ان کا باپ عبداللہ بن ابی ابن سلول گزرنے لگا، تو بیٹے نے کہا رک جاؤ۔ ابن ابی نے کہا کمبخت کیا ہے؟ عبداللہ نے کہا تو اس وقت تک اندر نہیں جا سکتا جب تک رسول اللہؐ اجازت نہ دے دیں۔ کیونکہ رسول اللہؐ باعزت ہیں اور تو ذلیل ہے۔ جب رسول اللہؐ پہنچے۔ آپ لشکر کے پیچھے چلا کرتے تھے۔ تا کہ پیچھے رہ جانے والوں راستہ گم ہو جانے والوں اور ان لوگوں کو دیکھ سکیں جن کو مدد کی ضرورت ہو۔ جب رسول اللہؐ پہنچے تو ابن سلول نے شکایت کی تو اس کے بیٹے عبداللہ

نے کہا۔"یارسول اللہؐ یہ اس وقت تک شہر میں داخل نہیں ہوسکتا۔جب تک آپؐ اجازت نہ دیں رسول اللہؐ نے اجازت دیدی تو عبداللہؓ بولے۔اب جبکہ رسول اللہؐ اجازت دے چکے ہیں تو اب شہر میں آسکتے ہو۔"

یہ عبداللہ (ابن ابی کے صاحبزادے) ایک اطاعت کیش مسلمان کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ آپ اپنے باپ کی حرکات سے بڑے تنگ دل ہوتے اور اس کی باتوں پر بڑے پشیمان ہوتے۔ مگر آپ کے دل میں اپنے باپ کے لیے محبت کے وہ جذبات بھی تھے جو ایک مہربان نیکوکار بیٹے کے دل میں ہونے چاہئیں۔جب آپ نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ آپ کے باپ کے قتل کا ارادہ فرمارہے ہیں تو آپ کے دل میں مختلف جذبات وعواطف متصادم ہوگئے۔جن کا آپ نے بڑی بہادری اور پاکیزگی سے مقابلہ کیا۔آپ اسلام سے بھی محبت کرتے تھے اور نبی کریمؐ کی اطاعت بھی آپ کو دل سے پسند تھی اور چاہتے تھے کہ آپؐ کا حکم نافذ ہو،خواہ وہ ان کے اپنے باپ کے بارے ہی میں کیوں نہ ہو مگر یہ بھی برداشت نہیں کہ کوئی اور ان کے باپ کی گردن اڑادے اور پھر ان کے سامنے چلتا پھرتا نظر آئے۔انہیں خطرہ تھا کہ کہیں نفس دھوکہ نہ دے اور شیطان نفس میں عصبیت اور خون کے بدلے کا جوش نہ پیدا کردے۔چنانچہ اپنے نبیؐ اور قائدؐ کے پاس آتے ہیں، تاکہ آپؐ کے سامنے اپنے دل کے وسوسے بیان کریں اور جس اذیت میں آپ پڑے ہوئے ہیں نبی کریمؐ اس سے نجات دلائیں۔

یہ ایک جلال ہے جو اس موقع پر قلب میں جلوہ گر ہوا ہے۔یہ جلال ایمانی ہے جو ایک انسان کے قلب میں متمکن ہے۔اور وہ نبی کریم ﷺ سے درخواست کررہا ہے کہ اس کو اس نفس کے لیے جو مشکل ترین کام ہے۔یعنی اپنے باپ کا قتل۔وہ سپرد کیا جائے۔اس درخواست میں ان کی نیت سچی تھی کیونکہ انہیں خطرہ تھا کہ دوسری صورت میں اس سے زیادہ سخت فعل کا مرتکب ہوجاؤں گا کہ جذبات انسانی مجھے ایک کافر کے بدلے میں مومن کے قتل پر مجبور کردیں گے اور جہنمی ہوجاؤں گا۔

یہ سچائی اور صفائی کا جمال ہے جس سے انہوں نے اپنے باپ کے بارے میں اپنے ضعفِ بشری کا مقابلہ کیا۔کیونکہ وہ کہتے تھے کہ خدا کی قسم خزرج کو یہ بات معلوم ہے کہ اپنے باپ کے

لے مجھ سے زیادہ نیکوکار کوئی نہیں۔ چنانچہ آپ اپنے نبی اور قائدؐ سے درخواست کرتے ہیں آپؐ اس کمزوری میں ان کی مدد کریں، اور اس تنگی سے نجات دلائیں، اس طرح نہیں کہ نبی کریمؐ کا حکم ٹال دیں یا اس میں کوئی تبدیلی کریں۔ کیونکہ حکم کی بہرحال اطاعت کرنی ہے۔ مگر اس طرح کہ آپؐ انہی کے ذمہ اپنے باپ کے قتل کا کام سپرد کردیں!

نبی کریمؐ اس نفسِ مومن کی الجھن دیکھتے ہیں تو بڑی فراخ دلی اور نرمی کے ساتھ ان کی الجھن کو دور فرما دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جب تک وہ ہمارے ساتھ رہے گا، ہم اس کے ساتھ نرمی برتیں گے اور حسنِ سلوک سے کام لیں گے۔ اس سے پہلے نبی کریمؐ حضرت عمرؓ کے مشورے پر فرما چکے ہیں۔

''اے عمرؓ! اس کا کیا جواب دو گے اگر لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں کو قتل کررہے ہیں؟''

نبی کریمؐ نے اس سارے مسئلہ میں ایک دانا قائد کی طرح فیصلہ فرمایا

پہلے آپؐ نے بے وقت روانگی کا حکم فرما دیا۔ اور سفر اس وقت جاری رکھا جب تک لوگ تھک نہ گئے تا کہ ان سے جاہلیت کی گندی عصبیت دور ہو جائے جسے دو متحارب آدمیوں کے نعروں نے بھڑکا دیا تھا۔ یعنی ایک جانب سے نعرہ لگا کہ اے جماعتِ انصار۔ اور دوسری جانب سے اے مہاجرین کا نعرہ بلند ہوا۔

نبی کریمؐ کا منشاء تھا کہ عبداللہ بن ابی بن سلول منافق کا پیدا کیا ہوا یہ فتنہ سرد کردیں۔ اور مہاجر اور انصار میں تاریخ کا منفرد بھائی چارہ اور مودت بیدار ہو جائے۔ پھر جب یہ دلکش منظر سامنے آتا ہے کہ ایک مومن عبداللہؓ (بن عبداللہ بن ابی) مدینہ کے دروازے پر تلوار لیے کھڑا ہے! اور جب اس کا باپ سامنے آتا ہے تو تلوار سے اسے آگے جانے سے روک رہا ہے تا کہ اس کی بات اسی پر چسپاں کی جائے کہ باعزت ذلیل کو نکال دے گا اور تا کہ وہ جان لے کہ رسول اللہؐ باعزت ہیں اور وہ خود ذلیل ہے۔ عبداللہ اپنے باپ کو اسی طرح روکے رکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ آکر اسے مدینہ میں داخلہ کی اجازت دیتے ہیں۔

گویا اس واقعہ اور اس مرحلہ پر عملی شکل میں اس منافق کے دل میں یہ بات اتار دی گئی کہ کون عزیز ہے اور ذلیل ہے۔

یہ رفعت و بلندی کا وہ اعلیٰ ترین مقام ہے۔ جس تک ایمان نے صحابہ کرامؓ کو پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ بھی انسان ہی تھے۔ ان میں ضعفِ بشری بھی تھا۔ اور انسانی خیالات بھی تھے۔

یہ واقعہ دراصل عقیدہ کی ایک انتہائی پیاری اور سچی تصویر ہے۔ اگر لوگ اس حقیقت کو محسوس کریں۔ بلکہ خود اس حقیقت کی چلتی پھرتی تصویر بن جائیں۔

حضرت انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ

''میں ابوطلحہؓ، ابوعبیدہ بن الجراحؓ، ابودجانہؓ، معاذ بن جبلؓ اور سہیل بن بیضاءؓ کی ساقی گیری کر رہا تھا اور نشہ سے سب کے سر ڈھلک چکے تھے کہ منادی نے آواز دی ''شراب حرام کر دی گئی۔'' بس اس سے پہلے کہ کوئی باہر سے اندر آئے یا اندر سے باہر جائے۔ ہم نے شراب پھینک دی اور مٹکے توڑ ڈالے۔ پھر ہم میں سے کچھ نے وضو کیا کچھ نے غسل کیا۔ اور ہم ام سلیم کی خوشبو لگا کر مسجد کو روانہ ہو گئے۔'' (تفسیر ابن کثیر)

حضرت ابوہریرہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم بیٹھے ہوئے شراب پی رہے۔ میں اٹھ کر نبی کریمؐ کے پاس آیا۔

تو جب میں آپؐ کے پاس پہنچا تو حرمتِ خمر کی آیت نازل ہو چکی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا۔ اور انہیں **فھل انتم منتھون** (کیا تم باز آ جاؤ گے) تک تحریمِ خمر سے متعلق آیت سنائی۔ جب میں نے آیت سنائی تو بعض لوگوں کے ہاتھوں میں پیالے تھے جن میں سے کچھ پی چکے تھے۔ اور کچھ باقی تھی۔ سب نے پیالوں کی باقی ماندہ شراب زمین پر بہا دی اور جو بوتلوں میں تھی وہ بھی انڈیل دی اور کہنے لگے ''اے ہمارے رب ہم باز آ گئے۔'' (ابن کثیر)

نہ لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے تنظیمیں قائم کی گئیں اور نہ حکومت کو سزائے موت، قید اور املاک کی ضبطی کے احکام دینے پڑے، اور قرآن کے حکم کی لوگوں نے بلا تاخیر اطاعت کے لیے آسانی سے فیصلہ کو نافذ کر دیا۔

صفیہ بن شیبہؓ روایت کرتی ہیں کہ:

"ہم سب حضرت عائشہؓ کے پاس جمع تھیں کہ عورتوں نے قریش کی خواتین اور ان کی فضیلت کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ بلاشبہ قریش کی عورتیں بڑی فضیلت کی مالک تھیں۔ لیکن خدا کی قسم انصار کی عورتوں سے زیادہ فضیلت والی، کتاب اللہ کی پوری طرح تصدیق کرنے والی، اور قرآن پر ایمان رکھنے والی عورتیں نہیں دیکھیں۔ جب سورۂ نور کی یہ آیت نازل ہوئی کہ عورتیں اپنے دوپٹے اپنے سینوں پر ڈالے رکھیں۔ تو ان کے مردوں نے ان کو جا کر آیت سنائی۔ اور ہر شخص نے اپنی بیوی بیٹی اور بہن اور تمام رشتہ دار خواتین کو یہ آیت سنائی۔ تو ہر ایک عورت اٹھی اور فوراً اللہ کے نازل کردہ حکم کی عملی تصدیق اور اس پر ایمان کے لیے چادر لپیٹ لی۔ (ابوداؤد)

مشرکین مکہ نے بہت سے مومنین کو ہجرت سے روک کر انہیں قید میں ڈالا ہوا تھا۔ انہیں سزائیں دیتے۔ اور اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے۔

جب معاہدہ حدیبیہ ہوا۔ تو اس میں یہ طے پایا کہ کافروں کے پاس سے بھاگ کر جو شخص مدینہ جائے گا نبی کریمؐ اسے واپس کریں گے۔

ابوبصیرؓ (عتبہ بن رسید) کسی نہ کسی طرح کافروں کی قید سے آزاد ہو کر پاپیادہ سات دن تک چلتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے۔ مشرکین نے دو آدمی ان کے پیچھے بھیجے تا کہ وہ معاہدہ حدیبیہ کے تحت انہیں واپس لائیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ سخت ترین مرحلہ تھا کہ ایک مسلمان کو مشرکین کے حوالے کر دیں کہ وہ انہیں سزائیں دیتے رہیں۔ حالانکہ وہ ہر قسم کی تکلیف و مشقت سہہ کر مدینہ پہنچے تھے۔ اور یہ سمجھے تھے کہ اب انہیں اس عذاب و تکلیف سے نجات مل جائے گی۔ ان کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ نبی کریمؐ انہیں پھر کفار کے حوالے کر دیں گے۔ جب رسول اللہؐ نے انہیں واپس ہونے کا حکم دیا اور انہیں قریش کے سفراء کے سپرد کر دیا تو کہنے لگے کیا یا رسول اللہؐ مجھے مشرکوں کے حوالے کریں گے تا کہ وہ مجھے اسلام قبول کرنے کی سزا میں مجھ پر انتہائی سخت گیری کریں۔ تو نبی کریمؐ نے فرمایا "اے ابوبصیر! ہم نے ان لوگوں سے جو معاہدہ کیا ہے وہ تو تمہیں معلوم

ہے۔اور ہمارے دین میں وعدہ خلافی جائز نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور تمہارے ساتھی مسلمانوں کے لیے کوئی نہ کوئی سبیل نجات پیدا فرمائے گا۔ابوبصیرؓ نے تعجب سے کہا۔یا رسول اللہؐ کیا آپؐ مجھے مشرکین کے حوالے کردیں گے۔تو نبی کریمؐ نے فرمایا ”جاؤ ابوبصیر جاؤ۔اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کوئی راہ نجات پیدا فرمائے گا۔“اور نبی کریمؐ نے ابوبصیرؓ کو قریش کے سفراء کے سپرد کردیا کہ وہ انہیں مکہ لے جائیں۔

اہل کوفہ میں سے ایک شخص نے حذیفہ بن الیمانؓ سے کہا۔”اے ابوعبداللہ! کیا آپ نے رسول اللہؐ کو دیکھا اور ان کی صحبت میں رہے۔“فرمایا ”ہاں بھتیجے!“۔اس نے کہا آپ کیا کرتے تھے۔فرمایا (اللہ کے راستے میں) جدوجہد کرتے تھے۔اس نے کہا اگر ہم حضورؐ کے زمانے میں ہوتے تو آپ کو زمین پر نہ چلنے دیتے، بلکہ کاندھوں پر اٹھائے لیے پھرتے۔ابوحذیفہؓ نے فرمایا میرے بھتیجے! ہم نے تو نبی کریمؐ کو خندق کے موقع پر دیکھا کہ رات گئے تک نماز پڑھتے رہے۔پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کون ہے جو دیکھ کر آئے کہ دشمن کیا کر رہا ہے؟ رسول اللہؐ نے جاکر دیکھنا اور پھر واپس آ کر حالت بیان کرنے کی قید بھی لگائی تھی۔تو میں خدا سے درخواست کروں گا کہ وہ جنت میں میرا ساتھی ہو جائے۔تو خوف کی زیادتی اور بھوک کی شدت اور سخت سردی کی بناء پر کوئی نہیں کھڑا ہوا۔جب کوئی نہیں کھڑا ہوا تو نبی کریمؐ نے مجھے بلایا۔تو جب آپؐ نے بلایا تو مجھے جانا پڑا۔آپؐ نے فرمایا ”ابوحذیفہ جاؤ،دشمن کو دیکھو کیا کر رہا ہے۔اور جب تک ہماری پاس نہ آ جاؤ کوئی بات نہ کرنا۔“ چنانچہ میں گیا اور دشمن پر نظر ڈالی تو دیکھتا کیا ہوں کہ آندھی اور لشکر خدا نے کافروں کی حالت ابتر کردی ہے۔ان کا کوئی برتن نہیں ٹھہرتا۔آگ نہیں جلتی اور خیمے قائم نہیں رہتے۔ابوسفیان کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔”اے قریش کے لوگو! آدمی کو اپنے ساتھی پر نظر رکھنی چاہیے۔اے قریش کے لوگو! سارے گھوڑے اور اونٹ ہلاک ہو گئے۔بنو قریظہ نے وعدہ خلافی کی اور ہمیں ان سے تکلیف اٹھانی پڑی اور ہوا اس قدر سخت ہے کہ نہ برتن ٹکتے ہیں نہ آگ جلتی ہے اور نہ خیمے کھڑے رہتے ہیں۔میرے خیال میں یہاں سے کوچ کرو۔میں تو چلتا ہوں۔“

حذیفہؓ کہتے ہیں میں رسول اللہؐ کے پاس آیا۔تو آپؐ اپنی ازواج میں سے کسی کی یمنی چادر

اوڑھ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مجھے بھی اپنے قدمِ مبارک کے پاس کھڑا کرلیا۔ اور چادر کا ایک کنارہ میرے اوپر ڈال دیا۔ آپؐ نے رکوع اور سجدہ فرمایا اور میں آپ کی چادر میں رہا۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو میں نے آپ کو ساری اطلاع دیدی۔ قریش کے یہ حالات بنو غطفان کو معلوم ہوئے تو وہ راستے ہی سے واپس ہوگئے۔" واقعہ خندق میں مسلمان جس عظیم واقعات سے دوچار ہوئے۔ انہیں جس قدر تکلیف اٹھانی پڑی اور انہیں جس قدر خوف ودہشت برداشت کرنی پڑی اس کی قرآن کریم نے یہ تصویر کھینچی ہے۔ "اس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے"۔ (الاحزاب۔۱۱)

بہر حال صحابہ کرامؓ بھی انسان تھے۔ اور انسانی طاقت بس اسی قدر ہے۔ جس قدر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلّف فرمایا ہے۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ کو کامیابی کا پورا پورا یقین تھا۔ اور نبی کریمؐ کی بشارت بھی تھی۔ اور تمام یمن اور شام کی فتوحات میں نبی کریمؐ نے پہلے سے بشارتیں دی تھیں۔ اس کے باوجود صحابہ کرامؓ پر ایک دہشت چھائی ہوئی تھی۔ جو انہیں متزلزل کر رہی تھی۔ پریشان کر رہی تھی؟ اور ان کے نفوس کو رنجیدہ کیے ہوئے تھی۔

اس صورت حال کی بہترین تصویر ابو حذیفہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ اپنے صحابہؓ کی حالت محسوس کر رہے تھے۔ ان کے نفوس کی اندرونی حالت سے باخبر تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ کون دشمن کی خبر لے کر واپس آئے گا؟ واپسی کی شرط لگاتے ہیں اور اپنے ساتھ جنت میں ہونے کی دعا دیتے ہیں۔ مگر کسی کی ہمت نہیں ہوتی۔ مگر جب ابو حذیفہؓ کو متعین فرمادیتے ہیں تو بقول ان کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ یہ صورتِ حال ایک انتہائی کربناک موقع پر پیش آئی۔

مگر اس ساری نازک صورت حال میں اور اس کربناک واقعہ میں بھی اللہ سے تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ وہ شعور مضمحل نہیں ہوتا جو اللہ کے قانون پر باقی رکھے ہوئے تھا۔ وہ اعتماد نہیں ڈگمگاتا جو ان قوانین پر تھا اور اس بات پر تھا کہ جب ان قوانین الٰہیہ کا ایک حصہ ظاہر ہوگیا ہے۔ تو باقی حصہ بھی یقیناً سامنے آئے گا۔

اسی لیے مومنین کے شعور میں یہ بات اتر گئی تھی کہ یہ کربناک صورتِ حال فتح وکامرانی کا

سبب بن جائے گی۔ کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کے اس قول پر یقین تھا۔

ام حسبتم ان تدخلو الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مسّتهم البأساء والضراء وزلزلواحتی یقول الرسول والذین امنوا معه متی نصر اللّٰہ الا ان نصر اللّٰہ قریب۔(البقرہ۔۲۱۴)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخلہ تمہیں مل جائے گا۔ حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھ اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ وہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

اب چونکہ وہ متزلزل ہیں اس لیے اللہ کی مدد بھی قریب ہے۔ اس لیے وہ پکار اُٹھے۔

هذا ماوعدنا اللّٰه ورسوله وصدق اللّٰه ورسوله۔ومازادهم الاایمانا و تسلیما۔(الاحزاب۔۲۲)

یہ وہی چیز ہے۔ جس کا اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی بات بالکل سچی تھی۔ اس واقعہ نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی کو اور بڑھا دیا۔

یہی اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم سے وعدہ کیا ہے۔ یہ دہشت، یہ کرب، یہ تنگی یہ تزلزل اور اس پر فتح و کامرانی کا وعدہ! اللہ اور اس کے رسولؐ نے نشانی بتائی۔ اور اس کی تطبیق بیان کی۔ اس لیے قلوب اللہ کی مدد اور وعدے پر مطمئن ہو گئے۔ اور اس سے ان کے ایمان اور تسلیم ورضا میں اضافہ ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ بہر حال انسان تھے۔ وہ انسانی مشاعر اور ضعفِ بشری سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ اور نہ ان سے یہ مطالبہ تھا کہ وہ حدودِ بشری سے تجاوز کر جائیں اور انسانی خصوصیات اور ممیّزات سے بالا تر ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں انسان بنایا تھا۔ فرشتہ یا کوئی اور شئے نہیں بنا دیا تھا۔ وہ انسانوں کی طرح خوفزدہ ہوتے اور تنگ دلی محسوس کرتے۔ اور قوتِ برداشت سے زیادہ خطرے میں متزلزل ہو جاتے۔

مگران سب باتوں کے باوجود ان کا اللہ تعالیٰ سے نہایت مضبوط رشتہ استوار تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے امیدیں وابستہ رکھتے اور ناامیدی سے محفوظ رہتے۔ اس طرح وہ تاریخ انسانی کے بے مثل افراد بن گئے تھے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم انسانی تاریخ کے ان بے مثل افراد کو اپنے سامنے رکھیں۔ ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ وہ انسان تھے۔ اور انسانی طبیعت کے ضعف اور قوت سے بالاتر نہیں تھے۔ ان کا امتیاز یہ تھا کہ وہ بشری خصوصیات اور آسمانی رشتہ کی حفاظت کرتے ہوئے انسانیت کے بلندترین مقام تک پہنچ گئے تھے۔

حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ ماغر بن مالکؓ نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے یارسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا جاؤ اللہ سے استغفار کرو اور توبہ کرو۔ ماغر چلے گئے اور پھر واپس آئے اور کہنے لگے یارسول اللہؐ مجھے پاک کر دیجئے۔ نبی کریمؐ نے پھر پہلے کی طرح ارشاد فرمایا۔ جب یہ واقعہ چار مرتبہ پیش آیا تو نبی کریمؐ نے استفسار فرمایا کس بات سے پاک کر دوں؟ کہا "زنا سے۔" تو رسول اللہؐ نے پوچھا کیا یہ پاگل ہے۔ لوگوں نے کہا کہ پاگل نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کیا شراب پی ہے؟ ایک شخص نے ماغر کا مونہہ سونگھا تو شراب کی بو نہیں آئی۔ اب نبی کریمؐ نے پوچھا کہ کیا تو نے زنا کیا ہے، کہا جی ہاں! پھر آپؐ نے رجم کا حکم دے دیا۔ دو یا تین روز کے بعد رسول اللہ لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور فرمایا۔ ماغر کے لئے استغفار کرو۔ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ساری امت میں تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو جائے۔

اسی طرح ایک دن آپؐ کے پاس کی ایک عورت آئی کہنے لگی یارسول اللہؐ! مجھے پاک کر دیجئے۔ آپؐ نے فرمایا تیرا ناس نہ ہو۔ جا استغفار کر اور اللہ سے توبہ کر۔ کہنے لگی آپؐ مجھے اسی طرح واپس کرنا چاہتے ہیں جس طرح ماغر بن مالکؓ کو کیا تھا؟ میں زنا سے حاملہ ہوں۔ آپؐ نے کہا تو؟ اس نے کہا جی ہاں! حضورؐ نے فرمایا جب تک ولادت ہو (اُس وقت تک کے لیے جاؤ) بریدہؓ کہتے ہیں کہ انصار میں سے ایک صحابیؓ اس کے کفیل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اس کے بچہ ہو گیا۔ نبی کریمؐ کے پاس اطلاع آئی کہ غامدیہ کے بچہ ہو گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ابھی ہم اس کو

رجم نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس کا بچہ چھوٹا ہے۔اسے دودھ کون پلائے گا۔انصار کے ایک آدمی نے کہا اس کی رضاعت میرے ذمہ ہے۔تو آپؐ نے اس کے رجم کا حکم دیدیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جب بچہ ہو جائے، پھر آنا جب بچہ ہو گیا تو آپؐ نے فرمایا جب اس کا دودھ چھڑالو اس وقت آنا جب اس نے دودھ چھڑا دیا تو بچہ کو لے کر نبی کریمؐ کے پاس آئی۔ بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا۔اور کہنے لگی اے اللہ کے نبیؐ میں نے اس بچہ کا دودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ روٹی کھانے لگا ہے۔

نبی کریمؐ نے بچہ مسلمانوں میں سے کسی کو دے دیا۔ پھر اس کے رجم کے لیے سینے تک گڑھا کھودا گیا۔لوگوں کو حکم دیا کہ اسے رجم کردیں۔خالد بن ولیدؓ آگے بڑھے اور انہوں نے پتھر اٹھا کر مارا تو خون کے چھینٹے حضرت خالدؓ کے مونہہ پر آگرے تو حضرت خالدؓ نے اسے برا بھلا کہا۔ اس پر نبی کریمؐ نے فرمایا اے خالد ایسا نہ کرو۔قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے،اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر کسی دلال نے کی ہوتی تو اس کی بھی مغفرت ہو جاتی۔ پھر آپؐ نے اس کی نماز پڑھائی اور اسے دفن کیا گیا۔

روایت ہے کہ حضرت یونس بن عبیدؓ کے پاس مختلف قیمتوں کے جوڑے تھے۔ایک قسم کے جوڑے چار سو روپے کے تھے۔اور ایک قسم کے دو سو روپے کے۔یونسؓ اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر نماز کو چلے گئے۔ایک دیہاتی آیا۔اس نے چار سو روپے والا جوڑا مانگا۔بھتیجے نے دو سو روپے والے دکھا دیئے۔اس نے اسی کو پسند کیا اور بخوشی لے کر چلا گیا۔راستے میں یونسؓ ملے تو اپنی دکان کا جوڑا دیکھ کر پہچان گئے۔اور دیہاتی سے پوچھا کتنے کا خریدا ہے۔اس نے کہا چار سو کا۔ آپؓ نے کہا دو سو سے زیادہ کا نہیں ہے۔چلو چل کر واپس کرلو۔دیہاتی بولا۔ہمارے یہاں تو یہ پانچ سو کا ہے اور میں اس پر بالکل راضی ہوں۔یونسؓ بولے۔چلو دین میں نصیحت اور خیر خواہی ساری دنیا کی دولت سے بڑھ کر ہے۔آپؓ اسے دکان پر لے آئے۔اور اس کے دو سو درہم واپس کیے۔اور اپنے بھتیجے کو برا بھلا کہنے لگے کہ کیا تجھے شرم نہ آئی؟ تجھے اللہ کا خوف نہیں آیا۔اتنا زیادہ نفع لیتے ہو۔اور مسلمانوں کی خیر خواہی نہیں کرتے۔بھتیجے نے کہا کہ اس نے اپنی خوشی سے

خریدا تھا۔فرمایا جو تم اپنے لیے پسند کرتے ہو،اس کے لیے کیوں نہیں پسند کرتے۔

یا ایھا النبی قل لازواجك ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا جمیلا۔ وان کنتن تردن اللّٰہ ورسولہ والدار الاخرۃ فان اللّٰہ اعد للمحسنات منکن اجرا عظیما۔(الاحزاب ۲۸۔۲۹)

اے نبیؐ اپنی بیویوں سے کہو اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کردوں۔اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور دارالاخرت کی طالب ہو۔تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں،اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

نبی کریمؐ نے اپنے لیے اور اپنے اہلِ بیت کے لیے ''گذر اوقات'' کی معیشت کو پسند فرمایا۔ اس لیے نہیں کہ آپؐ آسائشِ زندگی سے قاصر تھے۔بلکہ آپؐ کے لیے تو روئے زمین فتح ہو گئی۔ غنائم اور فئے کی کثرت ہو گئی تھی جب کہ وہ لوگ جن کے پاس کوئی مال نہیں تھا،وہ مالدار ہو گئے۔ مگر آپؐ کے گھر میں مہینہ گزر جاتا اور آگ نہ جلتی اور آپؐ لوگوں کو صدقے اور ہدیے دیتے رہتے۔یہ سب کچھ آپ نے آسائشِ دنیا سے بلندی اور اللہ کی نعمتوں کے طلبگار ہونے کی بناء پر کیا تھا۔آپؐ نے ملکیت کے باوجود رفعت وبلندی کی زندگی اختیار کی۔

نبی کریمؐ عقیدے اور شریعت کی بناپر مکلّف نہیں تھے کہ وہ اس قسم کی زندگی گزاریں جو آپؐ نے اپنے لیے اور اپنے اہلِ بیت کے لیے پسند فرمائی تھی۔طیبات دنیا آپؐ کے عقیدے اور شریعت میں حرام نہیں تھیں۔اور آپؐ نے خود بھی طیبات اپنے اوپر حرام نہیں فرمائی تھیں۔اگر وہ بغیر خواہش وجستجو کے اور بغیر ان کے پیچھے لپکے ہوئے اور ان کے حصول میں منہمک ہوئے بغیر خود بخود سامنے آجائیں۔

آپؐ نے اپنی امت کو اس بات کا پابند نہیں کیا کہ جس طرح کی زندگی میں گزار رہا ہوں وہ بھی گزاریں۔ہاں اگر کوئی لذائذ وآسائش سے بلند ہو کر اور خواہشاتِ نفس سے پوری طرح آزاد ہو کر اس زندگی کو اختیار کرے تو اس کے لیے درست ہے۔

مگر نبی کریمؐ کی ازواجِ مطہرات بہرحال عورتیں تھیں۔اور ان کے انسانوں جیسے مشاعر

تھے۔اپنی تمام فضیلت اور کرامت اور سرچشمۂ نبوت سے قرب کے باوجود آسائشِ دنیا کی طبعی رغبت ان کے نفوس میں بھی موجود تھی۔

جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ پر انعامات فرمائے اور ازواجِ مطہرات نے آسائش اور فراخی دیکھی۔تو نبی کریمؐ سے اپنے نفقہ کی وسعت کے بارے میں رجوع کیا۔تو نبی کریمؐ نے اس پر ناراضگی اور افسوس کا اظہار کیا۔کیونکہ آپؐ چاہتے تھے کہ جس قسم کی زندگی آپؐ نے اپنے لیے پسند فرمائی ہے،اسے آزادی،رفعت اور خوشی سے اپنائے رکھیں۔نہ دنیا سے کوئی لگاؤ ہو۔اور نہ دنیا کی کوئی اہمیت،اور آپؐ کی اور آپؐ کے ساتھ جو لوگ متعلق ہیں۔ان کی زندگی اس روشن اور بلند افق پر ہو۔اور دنیا سے ملوث ہونے سے زندگی بالکل پاک و صاف ہو۔اس وجہ سے نہیں کہ آسائش کی زندگی حرام ہے۔کیونکہ حلال و حرام واضح ہیں۔بلکہ اس لیے کہ دنیا کے خسیس میلانات سے آزاد و بے پرواہ رہا جائے۔

اِن ازواجِ مطہرات کے نفقہ میں وسعت کا مطالبہ کرنے سے نبی کریمؐ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ آپؐ نے اپنے صحابہؓ سے ملاقات بھی ترک فرمادی اور یہ امر صحابہؓ کے لیے تمام مصائب دنیا سے زیادہ تکلیف دہ تھا۔چنانچہ صحابہ کرامؓ نبی کریمؐ کے پاس آتے لیکن انہیں ملاقات کی اجازت نہ ملتی۔

امام احمدؒ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے۔نبی کریمؐ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے اور دروازے پر صحابہ جمع تھے۔حضرت ابوبکرؓ نے نبی کریمؐ سے اندر آنے کی اجازت چاہی تو انہیں نہ ملی۔پھر عمرؓ آئے اور اندر آنے کی اجازت چاہی،ان کو بھی اجازت نہیں ملی۔

مگر کچھ دیر بعد نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت دی۔آپؐ تشریف فرما تھے اور آپؐ کے چاروں طرف آپؐ کی ازواج بیٹھی تھیں۔اور آپؐ خاموش تھے۔

حضرت عمرؓ نے کہا میں نبی کریمؐ سے بات کروں گا،شاید آپؐ تبسم فرمائیں۔چنانچہ حضرت عمرؓ اپنی بیوی کے بارے میں بولے یا رسول اللہؐ! اگر زید کی بیٹی (حضرت عمرؓ کی بیوی) مجھ سے نفقہ

کا مطالبہ کرے تو میں اس کی گردن توڑ دوں۔ یہ سن کر رسول اللہؐ مسکرانے لگے۔ حتیٰ کہ آپؐ کے سامنے دندانِ مبارک ظاہر ہو گئے۔ آپؐ نے فرمایا یہ سب جو میرے اردگرد بیٹھی ہیں۔ نفقہ ہی کی درخواست کر رہی ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ حضرت عائشہؓ کو مارنے کے لیے اور حضرت عمرؓ حضرت حفصہؓ کو مارنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اور کہنے لگے کہ تم رسول اللہؐ سے ایسی چیز مانگ رہی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں۔ نبی کریمؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کو منع فرمایا۔ ازواج مطہراتؓ نے فرمایا۔ ہم آئندہ رسول اللہؐ سے ایسی چیز کا مطالبہ نہ کریں گی جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آیتِ خیار نازل فرمائی۔ تو حضورؐ نے حضرت عائشہؓ سے ابتداء فرمائی اور ان سے فرمایا۔ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، اور میری خواہش ہے کہ تم اس میں جلدی نہ کرنا دفتیکہ اپنے والدین سے اس بارے میں مشورہ نہ کرلو۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا کیا بات ہے۔ آپؐ نے ان کے سامنے یہ آیت (یا ایھا النبی قل لازواجک الخ) تلاوت فرمائی۔ یہ سن کر حضرت عائشہؓ بولیں۔ کیا آپؐ کی خدمت گزاری کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں میں اپنے والدین سے مشورہ کروں؟ نہیں، بلکہ میں تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ ہی کو پسند کرتی ہوں۔

اور آپؐ اپنی دوسری ازواج کو میرے بارے میں نہ بتایئے! نبی کریمؐ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے سخت گیر بنا کر نہیں بھیجا۔ مگر اس نے مجھے معلم اور سہولت دینے والا بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ سے جو پوچھے گی میں اسے بتا دوں گا۔

ہم اس واقعہ کے بعض پہلوؤں پر غور کرنا پسند کریں گے۔

یہ واقعہ اقدار کے بارے میں اسلامی تصور کو واضح کرتا ہے۔ دنیا اور آخرت کے لیے شعوری طریقہ کار متعین کرتا ہے اور مسلمان کے قلب سے آخرت اور دنیا کی اقدار کے درمیان ہر قسم کی کشمکش دور کر دیتا ہے۔ اور قلبِ مومن کو ہر اس لگاوٹ سے پاک کر دیتا ہے جو اس کے اور اللہ کے درمیان پرخلوص تعلق میں حائل ہو۔

یہ تو اس واقعہ کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کریمؐ اور آپؐ کے متعلقین کس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں کی زندگی تھی جو اگرچہ منفرد عظمت کے

حامل اور رفعت کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ گئے تھے۔ مگر انسانیت، انسانی مشاعر اور انسانی خصوصیات سے بالاتر نہ تھے۔ ان میں انسانی مشاعر اور جذبات تو موجود تھے، مگر وہ تمام آلائشوں سے نکھر کر پاکیزہ اور بلند ہو گئے تھے۔ اور انسانی طبیعت کا بہترین مزاج باقی رہ گیا تھا۔ جو کمال کے بلند ترین درجات تک پہنچنے میں حارج نہیں تھا۔

ان نادر مثالوں اور ضعف کے عارضی لمحات کے یہ متفرق نمونے ہمارے سامنے دورِ اول کے مسلم معاشرے کی پوری تصویر رکھ دیتے ہیں۔ وہ اسلامی معاشرہ جو اسلام کے صحیح مفہوم کے زیر سایہ ابھرا تھا۔ جس میں لوگوں نے دین کے تقاضوں کو پوری پوری طرح اپنا لیا تھا۔ انہیں ایمان کے مفہوم کا بھی بخوبی ادراک تھا۔ اور وہ بھی جانتے تھے کہ ایمان ان کے صحیح انسانی وجود پر کیا ذمہ داریاں ڈالتا ہے۔ مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ اسلام، خدا کے بندوں پر حکمرانی کی خاطر ان کے ذمہ چند فرائض عائد کر دیتا ہے۔ بلکہ اگر انسان صحیح معنی میں انسان بننا چاہتا ہے تو انسان کا صحیح وجود یہی ہے جو اسلام نے سامنے رکھا ہے۔ اور جو خلافتِ ارضی کا ٹھیک ٹھیک مطالبہ اور تقاضا ہے۔ انسان صرف کھانے پینے والا وجود نہیں ہے کہ وہ دنیا میں جس طرح بن پڑے اپنے دن گزارتا رہے۔ اور جس وقت جذبات و میلات کا جو تقاضا ہو وہ کر گزرے۔ اور کائنات میں انسان کے بلند مقام کو قطعاً ملحوظ نہ رکھے۔

دورِ اول کے مسلمانوں کے ذہنوں میں صحیح انسان کے جانچنے کا یہی پیمانہ تھا۔ جو انہوں نے کلام اللہ اور سنتِ رسولؐ سے اخذ کیا تھا۔ اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو استوار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ روئے زمین کی سیادت و قیادت کا انہی کو حق حاصل ہے اور وہ ساری انسانیت کے بالمقابل ایک غالب قوت اور اسے صحیح راستے پر لے کر چلنے والے قائد ہیں۔

درحقیقت اسلام انسان کو اس کا صحیح مقام دیتا ہے۔ اور انسان کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں کو انکے صحیح مقام پر رکھ کر ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے۔ ان تمام قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔ پھر ان قوتوں کا ربط و تعلق ناموسِ کائنات سے قائم کرتا ہے۔ جس سے انسان کی حقیقی تصویر ابھرتی ہے اور انسان محدود دنیاوی اور مادی قوت کے بجائے اللہ کے تخلیق کردہ ناموسِ عظیم کے مطابق پوری

کائنات کے ساتھ مل کر فعال قوت بن جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس سے معجزات کی قبیل کے امور ظاہر ہوتے ہیں جو اس مسلم معاشرے میں ظاہر ہوئے جس کے ہم نے چند نمونے پیش کیے اور جس کے بارے میں تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ انسانوں کے درمیان انصاف کی بنیادوں پر قائم ہونے والی زندگی کی عظیم ترین کوشش تھی۔ اور زندگی کو تمام پہلوؤں۔ روحانی، اجتماعی، اقتصادی، علمی اور عملی۔ پاکیزہ انسانی معیار پر نشو ونما دینے کا عظیم ترین اقدام تھا۔ اس معاشرے میں انانیت اور خود پسندی کے جذبے کے تحت ساری خیر و بھلائی سمٹ کر چند لوگوں میں جمع نہیں ہوگئی تھی۔ بلکہ خیر سب کے لیے عام تھا۔ حتیٰ کہ ان کو بھی اس خیر کثیر سے حصہ ملا۔ جو اس دن پر ایمان ہی نہیں رکھتے تھے۔ اور ان صلیبیوں کو بھی جو اس دین سے برسر پیکار تھے!

ایمان کا یہ بلند تر درجہ۔۔۔ انسان کو اس کے صحیح مقام پر استوار کرنے والی یہ اعلیٰ شکل۔۔۔ انسانی قوت کا فکر و عمل اور شعور کے تمام میدانوں میں یہ عظیم ارتقاء۔۔۔ انسانی وجود کی یہ پاکیزہ تصویر جو خارج از بشریت تو نہیں ہے مگر اس نے انسانی خصوصیات کے تحفظ کے ساتھ تمام فضائل اپنا لیے۔ (ماخوذ۔ کیا ہم مسلمان ہیں)

☆☆☆☆☆☆

کیتھرین بُلاک (کینیڈا)

(CATHERINE BULLOCK)

(ڈاکٹر عبدالغنی فاروق)

کیتھرین بلاک کینیڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کی طالبہ ہیں اور پی ایچ ڈی کررہی ہیں۔انہوں نے اسلام قبول کرنے کے صرف بارہ گھنٹے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کی،تو ایک نئے احساس اور تجربے سے دوچار ہوئیں۔۔۔اپنے اس تاثر کو انہوں نے خوبصورت ادبی انداز میں قلم بند کردیا۔۔۔ان کی اصل انگریزی تحریر ٹورانٹو کے ISLAMIC VOICE میں شائع ہوئی جہاں سے اسے اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی دعوہ اکیڈمی کے انگریزی ماہانہ جریدے "دعوہ ہائیلائٹس" نے اخذ کیا (شمارہ جون ۱۹۹۶ء)۔اردو میں اس کا ترجمہ جسٹس ملک غلام علی مرحوم کی لائق نواسی حمیرا اسلمیٰ نے کیا ہے۔ان کے شکریے کے ساتھ نذرِ قارئین ہے۔

میں یہاں نیچے کیا کر رہی ہوں؟ میں حیران ہوں،میری ناک اور میری پیشانی فرش کی جانب دبے ہوئے ہیں جب کہ میں سجدہ کی حالت میں نماز میں جھکی ہوئی ہوں۔میرے گھٹنے درد کرتے ہیں۔میرے بازو کے پٹھے کھنچے جاتے ہیں کیونکہ میں اپنے ماتھے پر دباؤ کو کم کرنا چاہتی ہوں۔میں اس شخص کے عجیب وغریب،نامانوس کلمات کو سنتی ہوں جو مجھ سے آگے نماز ادا کررہا ہے۔یہ عربی زبان میں ہے،اور وہ جانتے ہیں جو وہ کہہ رہے ہیں اگر چہ کہ میں یہ سب کچھ نہیں جانتی۔اس وجہ سے میں اپنے الفاظ کو خود ترتیب دیتی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اللہ مجھ پر۔۔۔میں جو صرف بارہ گھنٹے قبل مسلمان ہوئی ہوں۔۔۔مہربان ہوگا۔

اچھا اللہ تعالیٰ! میں نے اسلام اس لیے قبول کیا کہ میں آپ پر یقین رکھتی ہوں اور اس لیے کہ اسلام میرے لیے کوئی معنی ومفہوم رکھتا ہے،میرے ذہن کو متاثر کرتا ہے۔کیا میں نے صرف یہ کہا تھا۔۔۔؟ میں یاد کرتی ہوں تو اپنے آپ کو رقت میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں۔میرے دوست

کیا کہیں گے اگر انہوں نے مجھے اس طرح دیکھ لیا۔۔۔سجدہ میں، ناک زمین کے ساتھ دباتے ہوئے۔۔۔؟ وہ سب مجھ پر ہنسیں گے۔''کیا تم نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا ہے؟'' وہ مجھ سے پوچھیں گے،''تم سنجیدگی کے ساتھ نہیں بتا سکتیں کہ تم ایک مذہبی عورت ہو!''

''مذہبی۔۔۔''میں کبھی ایک پر مسرت غور و فکر کرنے والی دہریہ تھی۔ میں ایک ایمان رکھنے والی اور ایک مسلمان میں کیسے تبدیل ہو گئی؟ میں اپنے آپ سے سوال کرتی ہوں۔ میں اپنے ذہن کو ماضی کی طرف موڑتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ ایک طوفانی دورہ کی شکل میں اپنے اس تمام سفر میں سے گزروں۔ لیکن یہ سب کہاں سے شروع ہوا؟

ہو سکتا ہے کہ یہ سب تب شروع ہوا ہو جب میں پہلی بار باعمل مسلمانوں سے ملی تھی۔ یہ ۱۹۹۱ء میں کوئینز یونیورسٹی کنگسٹن، اونٹاریو، کینیڈا کا ذکر ہے۔۔۔میں ایک کشادہ ذہن کی، متحمل و بردبار، آزاد خیال عورت تھی جس کی عمر ۲۴ سال تھی۔ میں مسلمان عورتوں کو انٹرنیشنل سینٹر میں چلتا پھرتا دیکھتی اور مجھے ان پر افسوس ہوتا۔۔۔میں جانتی تھی کہ وہ مجبور ہیں۔ میرے دکھ میں اضافہ ہو جاتا تھا جب میں ان سے پوچھتی تھی کہ وہ اپنے بال کیوں ڈھانپتی ہیں؟ وہ گرمیوں کے موسم میں بھی طویل آستینوں والی قمیض کیوں پہنتی ہیں؟ ان کے ساتھ مسلمان ممالک میں اتنا برا سلوک کیوں کیا جاتا ہے۔۔۔؟ اور وہ مجھے بتاتیں کہ وہ نقاب اس لیے اوڑھتی ہیں اور اس طرح کا لباس اس لیے پہنتی ہیں کیونکہ اللہ نے ان سے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔۔۔۔بے چاری عورتیں۔۔۔ان کے ساتھ مسلمان ممالک میں جو سلوک ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ کیا کہتی ہیں؟

''یہ کلچر ہے'' وہ جواب دیں گی۔

میں جانتی ہوں کہ وہ گمراہ ہیں، جن کو معاشرے کے رنگ میں ڈھال لیا گیا ہے اور جن کی برین واشنگ ابتدائی عمر سے ہی کی گئی ہے تاکہ وہ عورتوں کے ساتھ اس قدر ظالمانہ سلوک کیے جانے پر عقیدہ کو مضبوط کرئیں۔۔۔لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ کس قدر خوش ہیں، وہ کس قدر مشفق ہیں، اور وہ کس قدر مضبوط دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے مسلمان مردوں کو انٹرنیشنل سینٹر کے

گردگھومتے پھرتے دیکھا۔وہاں ایک آدمی لیبیا سے بھی تھا جو دہشت گردوں کی سرزمین ہے۔ میں کانپتی تھی جب کبھی ان کو دیکھتی تھی، کہ کہیں وہ خدا کے نام پر میرے ساتھ کچھ کر نہ گزریں۔ میں اس تصویر کو ذہن میں تازہ کرتی جو ٹی وی پر عرب مردوں کے جھگڑالو ہجوموں کو صدر بش کے پتلے میں جلاتا دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔۔۔وہ یہ سب خدا کے نام پر کر رہے تھے۔۔۔ان کا خدا کیا ہے میں سوچتی۔۔۔میں جو اس بیچ میں خود کو محفوظ تصور کرتی کہ اللہ ہم کمزور انسانوں کی صفات رکھنے والا کوئی مجسم پیکر ہے۔۔۔لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کس قدر مدد کے جذبے سے سرشار ہیں۔میں نے ان میں سکون کی ایک لہر محسوس کی۔

ان کا عقیدہ کیسا ہوگا میں نے سوچا۔مگر اس نے مجھے متذبذب کر دیا۔میں قرآن پڑھ چکی تھی اور اس کے بارے میں کوئی خاص چیز نہیں تلاش کر پائی تھی۔یہ خلیج کی جنگ چھڑنے سے پہلے کی بات ہے۔یہ کس قسم کا خدا ہے جو مردوں کو جنگ پر جانے پر اکساتا ہے۔ایک دوسرے ملک کے معصوم شہریوں کو قتل کرنے کے لیے عورتوں کی بے حرمتی کرنے کے لیے،امریکہ کے خلاف مظاہرے کرنے کیلئے۔میں نے فیصلہ کیا کہ بہتر ہوگا میں اس مقدس کتاب کا مطالعہ کروں جس کے بارے میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس پر چل رہے ہیں۔میں نے پینگوئن کلاسک کا مطالعہ کیا جو یقیناً ایک قابلِ اعتماد کتاب ہے،اور میں اس کو ختم بھی نہ کر پائی کیونکہ میں نے اسے سخت ناپسند کیا تھا۔اس میں ایک ایسی حیثیت کا ذکر تھا جس میں نیکوکاروں کے لیے کنواری عورتیں تھیں (سوال یہ ہے کہ ایک نیکوکار کو جنت میں ایک کنواری عورت کے ساتھ کیا کام ہے؟)اس میں ایک خدا کا ذکر تھا جو ایک ضرب سے پورے شہر تباہ کر رہا تھا۔اس میں کوئی تعجب نہیں (اگر ان سب باتوں کو دیکھا جائے جو خدا سے منسوب تھیں) کہ عورت کو مظلوم،مجبور بنا دیا گیا تھا اور یہ مذہبی جنونی جو امریکہ کے جھنڈے کو آگ لگانے کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں،میں نے سوچا۔لیکن میں جن مسلمانوں سے اس کا ذکر کرتی وہ حیران رہ جاتے۔ان کا قرآن ان باتوں کو اس انداز سے نہیں کہتا تھا۔شاید میرے پاس ایک غلط ترجمہ قرآن آ گیا تھا۔۔۔؟

اچانک وہ شخص جو نماز پڑھ رہا تھا اور میں جس کی اقتدا کر رہی تھی کھڑا ہو جاتا ہے۔میں بھی

کھڑی ہوجاتی ہوں میرے پاؤں اس لمبی سکرٹ میں جو میں پہنے ہوئے ہوں الجھ جاتے ہیں اور میں تقریباً لڑکھڑا جاتی ہوں۔میں ناک سے سوں سوں کر کے آواز نکالتی ہوں۔جب کہ اس طرح سانس لینے کے لیے اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی ہوں۔مجھے اللہ سے دعا مانگنے پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔پیارے خدا، میں یہاں اس لیے ہوں کہ میں آپ پر یقین رکھتی ہوں اور کیونکہ عیسائیت، یہودیت، اسلام، ہندوازم، سکھ ازم اور بدھ ازم کی میری ریسرچ کے دوران اسلام نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔جھکنے کی حالت میں جب کہ میرے ہاتھ میرے گھٹنوں پر ہیں میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی شدید ترین کوشش کرتی ہوں۔اللہ، ازراہِ کرم مجھے اچھا مسلمان بننے میں مدد فرمائیے۔لیکن کبھی بھلا تم ایک اچھی مسلمان کیسے ہو سکتی ہو؟۔۔۔ایک سفید فام مغربی عورت جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، ایک ایسے مذہب کی جانب مائل ہو جائے جو اپنی عورتوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیتا ہے۔لیکن کنگسٹن کے مسلمان میرے دوست بن گئے ہیں۔میں احتجاج کرتی ہوں۔انہوں نے بغیر کسی سوال کے مجھے اپنے معاشرے میں گرمجوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔میں یہ بھول گئی کہ وہ مجبور ہیں اور دہشت گرد ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے سفر کا نقطۂ آغاز ہے۔لیکن میں اب بھی ایک دہریہ ہوں یا کیا میں واقعی ہوں؟ میں نے تاروں بھری راتوں میں دیکھا تھا اور کائنات پر غور کیا تھا۔ہیروں جیسے ستارے جو سیاہ آسمان پر چمک چمک کر مجھے پر اسرار پیغامات بھیجتے تھے۔میں نے خود کو اپنی ذات سے زیادہ بڑی کسی شے سے مربوط پایا۔کیا یہ ایک اجتماعی انسانی احساس تھا؟ امن اور سکون ستاروں کے ذریعے مجھ تک بہتا ہوا آتا ہے۔کیا میں اپنے آپ کو اس احساس سے تہی کر سکتی تھی کہ کوئی بالاتر وجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بالاتر احساس ہے؟

کیا آپ نے کبھی بھی اللہ کے وجود کے بارے میں شک نہیں کیا ہے؟ میں اپنی عیسائی اور مسلمان عقیدہ رکھنے والی دوستوں سے پوچھتی ؟نہیں، وہ جواب دیتیں نہیں نہیں یہ بات مجھے پریشان کر دیتی۔کیا خدا اتنا زیادہ واضح اور نمایاں ہے؟ پھر ایسا کیسے ہوا کہ میں خدا کو نہیں دیکھ سکی۔یہ مجھے اپنے تصور کا بے حد پھیلاؤ محسوس ہوتا۔دور وہاں ایک وجود ہو جو میرے طرزِ زندگی

کو متاثر کر رہا ہو۔ خدا کھربوں انسانوں کو دعائیں مانگتے ہوئے کیسے دیکھ اور سن رہا ہے، اور انسان کی زندگی کے ایک ایک سیکنڈ کے ساتھ معاملہ کر رہا ہے؟ یہ ناممکن ہے، اور دنیا میں ناانصافی کا اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ موجود رہنا؟ بچے جو جنگوں میں مر رہے ہیں۔ یہ ایک انصاف پسند، اچھے خدا کے وجود کی نفی پر دلالت کرتا ہے۔

ہم دوبارہ جھکتے ہیں اور یہ میں ہوں جو ناک سے سوں سوں کی آواز نکال رہی ہے اور اطراف میں اپنی انگلیوں کو اپنے نئے جائے نماز پر دیکھ رہی ہے۔ مجھے اپنی جائے نماز پسند ہے۔ اس کا ایک مخملی سا احساس ہے اور چند رنگ جو میرے پسندیدہ ہیں، ایک کاسنی مسجد جس کے پس منظر میں سبز رنگ ہے۔ اس پر ایک راستہ بھی ہے جو ایک سیاہ دروازے کی جانب راہنمائی کرتا ہے جو کہ راستہ سچائی لیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ یہ مغالطے میں ڈالنے والا بھی مگر ہے تو سہی۔ میں خوش ہوں کہ اس راستے نے مجھے بلایا ہے۔ جب میں بہت چھوٹی تھی تب میرے پاس دنیا کی ایک پوری تصویر معمہ کی شکل (Jigsaw) میں تھی۔ یہ ادھر ادھر بکھر گیا کسی لمحہ میں جب میں گریجوایشن سے پہلے اپنی تعلیم کے تیسرے اور چوتھے سال میں تھی۔ کنگسٹن میں میں نے خود کو یاد دلایا کہ کبھی میں ایک باقاعدہ چرچ جانے والی تھی، کسی حد تک شرمندہ، کیونکہ میں جانتی تھی کہ مذہبی لوگ ٹھنڈے، نرم خو، پرکشش، اکتا دینے والے اور فرسودہ لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن اس وقت خدا مجھے واضح طور پر دکھائی دیتا تھا۔ کائنات بے مقصد تھی اگر اس کا ایک ایسا پیدا کرنے والا نہ ہو اور جسے مطلق العنان بھی ہونا چاہیے۔ چرچ سے نکلتے ہوئے میرے پاس ہمیشہ ایک ہلکا پھلکا خوشی کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اس احساس کے گم ہو جانے کے نقصان کو محسوس کیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا خدا سے کبھی جو ایک تعلق تھا دوبارہ بحال ہو جائے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ میرے سفر کا آغاز ہو؟ میں نے دوبارہ دعا کی کوشش کی مگر اس کو غیر معمولی طور پر مشکل پایا۔ عیسائیوں نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ جو خدائے یسوع مسیح میں یقین نہیں رکھتے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ مگر ان لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے جنہوں نے کبھی حضرت عیسیٰ کے بارے میں سنا تک نہیں؟ یا وہ لوگ جو اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہیں اور عیسائی معاشرہ تاریخی طور پر یہ دعویٰ کرتا آ رہا تھا کہ عورتیں

کمتر ہیں، اس وجہ سے کہ یہ عیسائیت ہی بتاتی تھی کہ یہ حضرت حوّا کی سزا تھی۔ عورتوں کو تعلیم سے منع کر دیا گیا تھا۔ ووٹ دینے سے بھی اور زمین کی ملکیت حاصل کرنے سے بھی۔

عیسائی عقائد کے مطابق خدا ایک بارعب شخص تھا جس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ میں اس سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ میں عیسائیت کی پیروی نہیں کر سکتی تھی اس لیے کہ معنوی طور پر خدا کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ مگر پھر میں نے عورتوں کے حقوق کے علمبرداروں کو دیکھا، جو اللہ پر یقین رکھتے تھے اور عیسائی عورتوں کو جو حقوقِ نسواں کی علمبردار تھیں اور مسلمان عورتوں کو جو اسلام میں یقین رکھتی تھیں۔ میں نے دعا مانگنا شروع کر دی اور خود کو ایک سابقہ عیسائی حقوقِ نسواں کی علمبردار ایمان رکھنے والی قرار دیا۔ میں نے وہی ہلکا پھلکا سا احساس دوبارہ محسوس کیا۔ ہو سکتا ہے کہ خدا کا وجود ہو۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی کے واقعات کا جائزہ لینا شروع کیا اور اندازہ کیا کہ اتفاقات اور قسمت میرے لیے خدا کے انعامات تھے۔ لیکن میں نے نہ کبھی ان کو محسوس کیا اور نہ خدا کا شکر ادا کیا۔ میں حیران ہوں کہ خدا اس قدر مہربان ہے اور اس کی مہربانی اور کرم نوازی میں فرق نہیں آتا لیکن میں بے وفا ہوں۔

میرے کان اور پاؤں خوشگوار سی سنسناہٹ کی زد میں ہیں جو دھونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی دھلائی ہے جو مجھے پاکیزہ بناتی ہے اور مجھے نماز میں خدا تک پہنچنے کی اجازت دیتی ہے۔ خدا ــــ جو ایک بارعب دیوتا ہے۔ مجھے خوف، حیرت اور امن کا احساس ہوتا ہے۔ از راہِ کرم مجھے راستہ دکھائیں۔ مگر یقیناً آپ دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا بہت پیچیدہ ہے، بہت زیادہ خوبصورت ہے اور اسی قدر متوازن بھی ہے کہ اسے حادثہ قرار دینا مشکل ہے یا یہ ارتقائی قوتوں کا اندھا نتیجہ ہو؟ کیا آپ جانتے کہ سائنس نے کبھی بھی اسلام سے اختلاف نہیں کیا؟ میں تصوراتی عدالت کی بدولت اذیت میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ کیا انہوں نے ان چیزوں پر ریسرچ نہیں کیا ہے؟ شاید یہ سب سے زیادہ فیصلہ کن راستہ تھا۔ میں نے ریڈیو پر ایک ماہرِ طبیعات کا انٹرویو سنا تھا جو یہ وضاحت کر رہا تھا کہ کیسے جدید سائنس نے انیسویں صدی کے مادی مفروضات کو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور جو سائنسی طور پر اس نظریہ کا قائل تھا کہ بہت سے واقعات ایسے رونما ہوئے

جو بے معنی تھے اور مبہم تھے اگر ان سب کے پیچھے ذہانت اور کوئی مقصد یا ارادہ کارفرما نہ ہوتو ؟ درحقیقت سائنسی تجربات طبعی اشیا کا محض جامد مشاہدہ نہ تھے۔ مشاہدہ نے اس راستے کو ہی بدل ڈالا جس پر طبعی واقعات کا سلسلہ رونما ہو رہا تھا اور اس سے پتہ چلتا تھا کہ ذہانت ہی کائنات کا انتہائی بنیادی عنصر ہے۔ میں نے اور زیادہ مطالعہ کیا۔ میں نے دریافت کیا کہ صرف انتہائی شدت کے ساتھ جدوجہد کرنے والے ماہرین بشریات جو ہار ماننے کے لیے تیار ہی نہ تھے ابھی تک ارتقاء کی تھیوری میں یقین رکھتے تھے۔ اگر چہ کوئی بھی اس کو با آواز بلند اس لیے نہیں کہہ رہا تھا کہ اس کو اپنی ملازمت کے چلے جانے کا خطرہ تھا۔ میرا معمہ (Jigsaw) ادھر ادھر بکھرنا شروع کر رہا تھا۔

اچھا آپ نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ خدا موجود ہے۔ آپ اس طرح واحد عقیدہ پر ایمان رکھنے والے بن گئے۔ لیکن عیسائیت بھی تو عقیدہ واحد پر ایمان لانے کا نام ہے۔ یہ تمہارا ورثہ ہے اس کو کیوں ترک کریں؟ ابھی تک یہ سوال کرنے والے متذبذب ہیں۔ لیکن تمہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ان سب میں سے سب سے زیادہ آسان سوال ہے جواب دینے کے لیے۔ میں مسکراتی ہوں۔ میں نے جان لیا کہ کس طرح قرآن سائنس کی مخالفت نہیں کرتا جب کہ بائبل ایسا کرتی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ بائبل کی کہانیاں لفظ بہ لفظ پڑھوں مگر میں نے پتہ چلایا کہ میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ سائنسی حقائق بائبل کے بیانات کے خلاف تھے مگر سائنس کے حقائق قرآن کے بیان سے اختلاف نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ سائنس قرآن کی اب تک نا قابلِ وضاحت آیات کی تصدیق بھی کر رہی ہے۔ یہ حیران کن تھا۔ ایک آیت تھی کہ کس طرح پانی تازہ پانی کے دریاؤں سے جو بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں سمندر کے کھارے پانی سے نہیں ملتا تھا۔ آیات جو پیدائش کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتی ہیں۔ وہ آیات جو سیاروں کے مداروں کا حوالہ دیتی ہیں۔ ساتویں صدی کے سائنس دان ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر محمد کس طرح اس قدر منفرد انداز کے ذہین اور عقلمند ہو گئے۔

میرا ذہن مجھے قرآن کی جانب کھینچتا تھا مگر اس نے مزاحمت کی۔ میں نے دوبارہ چرچ جانا

شروع کردیا اورتقریباً ہربار اپنے آپ کوآنسوؤں میں ڈوبا ہوا پایا۔عیسائیت میرے لیے مشکل تحتی جارہی تھی۔اتنی زیادہ کہ میرے لیے اس میں اب کوئی مفہوم باقی نہ رہا تھا۔تین خداؤں کاعقیدہ،یہ عقیدہ کہ خدادرحقیقت عیسیٰ کی شکل میں تھا۔حضرت مریمؑ کی عبادت،حضرت عیسیٰ کی عبادت نہ کہ خدائے واحد کی۔پادریوں نے مجھے بتایا کہ جب خدا کی ذات پرغوروفکر کروں توعقل پس پشت ڈال دوں۔تین خداؤں کاعقیدہ یا تثلیث مبہم تھااور نہ اس کے مفہوم کی کوئی ضرورت تھی۔ میں نے مزید گہرائی تک کھوج لگایا۔ آخر کار میں اپنا کلچر کیسے چھوڑ سکتی تھی۔ اپناورثہ،اپناخاندان؟کوئی نہیں سمجھے گااور میں تنہارہ جاؤں گی۔میں نے ایک اچھی عیسائی بننے کی کوشش کی۔میں نے مزید علم حاصل کیا۔۔۔میں نے دریافت کیا کہ ایسٹر(Easter)کاآغاز حضرت عیسیٰ کی وفات کے دوسوسال بعدشروع کیا گیا۔یہ کہ حضرت عیسیٰ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خدا کے وجود کی تجسیم ہیں،بلکہ اکثر یہ کہا کہ وہ انسان کی اولاد ہیں،یہ کہ تثلیث کاعقیدہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے تین سو سال بعد قائم ہوا،یہ کہ نیقیائی عقیدہ(Nicence Creed)جس کو میں ایمانداری کے ساتھ ہر ہفتہ دہراتی تھی۔ہرلفظ پرتوجہ مرکوز کرتے ہوئے، انسانوں ہی کے ہاتھوں لکھا گیا تھا،ایک سیاسی میٹنگ کےدوران تاکہ اقلیت کےنظریہ کوجس کے مطابق عیسیٰ خدا کے بیٹےقرارپائے تھے کہ مصدقہ بنایا جاسکےاوراکثریت کانظریہ"حضرت عیسیٰ اللہ کےپیغمبر تھے"ہمیشہ کے لیےترک کردیا گیا۔مجھے سخت غصہ تھا!چرچ نے مجھے یہ سب باتیں کیوں نہیں سکھائیں؟اچھا،میں جانتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟لوگ سمجھ جاتے کہ وہ خدا کی عبادت کہیں اور جا کر بھی کرسکتے ہیں اوران کی عبادت واقعی ان کے لیے کوئی مقصد نہیں رکھتی۔میں صرف ایک خدا کی عبادت کروں گی نہ کہ تین کی،نہ مقدس باپ کی نہ بیٹے کی،اور نہ روح القدس کی،نہ ہی حضرت عیسیٰ کی خدا کےطورپر،نہ ہی بزرگوں کی،اور نہ ہی مریمؑ کی۔کیامحمدؐ واقعی اللہ کے رسول ہوسکتے تھے؟کیاقرآن اللہ کا کلام ہوسکتا تھا؟میں نے قرآن پڑھنا جاری رکھا۔اس نے مجھے بتایا کہ حضرت حواتنہا زمین پراتارے جانے کی ذمہ دار نہیں تھیں۔یہ کہ ایمان نہ لانے والے مجھ پر ایمان لانے کی وجہ سے ہنسیں گے کہ لوگ محمدؐ کےنزولِ وحی کے دعویٰ پرسوال اٹھائیں

گے۔یہ سچ دکھائی دیتا تھا۔اسلام مجھے کہتا تھا کہ خدا کو سمجھنے کے لیے میں اپنی عقل کا استعمال کروں،یہ علم حاصل کرنے کے لیے میری حوصلہ افزائی کرتا تھا۔اس نے مجھے بتایا کہ جو کوئی بھی خدائے واحد پر ایمان لائے گا (یہودی،عیسائی،مسلمان یا جو کوئی بھی) وہ انعامات حاصل کرے گا۔یہ بہت ہمہ گیر مذہب دکھائی دیا۔

ہم دوبارہ کھڑے ہوتے ہیں اور ابھی تک کھڑے ہوئے ہیں۔پھر دوبارہ نیچے جھکتے ہیں، آرام کی حالت میں اور ہمارے ہاتھ ہمارے گھٹنوں پر ہیں۔میں خدا کو اور کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے کہنے کے لیے اور کچھ زیادہ سجھائی نہیں دے رہا۔دعا بہت طویل لگ رہی ہے،میں آہستہ سے سانس باہر نکالتی ہوں،ابھی تک سوں سوں کر رہی ہوں،کیونکہ کھڑے ہونے،جھکنے اور پھر کھڑے ہونے سے میری سانس پھول گئی ہے۔کیا تم سنجیدگی سے سوچ رہی ہو کہ میں ایک ایسے مذہب میں بخوشی داخل ہو جاؤں،جو مجھے ایک دوسرے درجہ کی شہری بنا دے؟ میں اپنے سوال کرنے والوں سے مطالبہ کرتی ہوں۔تم جانتے ہو کہ مسلمان ممالک میں عورتوں کی بہت تذلیل کی جاتی ہے،بالکل اسی طرح جیسے مغرب میں مگر یہ سچے مسلمان نہیں ہیں اور پردہ کو مسئلہ نہ بناؤ،کیا تم نہیں جانتے ہو کہ عورتیں حجاب اوڑھتی ہیں محض اس وجہ سے کہ خدا ان سے ایسا کرنے کے لیے کہتا ہے؟ کیونکہ وہ اللہ کے احکامات پر یقین رکھتی ہیں،تاہم مجھ میں حجاب لینے کی ہمت کیسے پیدا ہوگی؟ شاید میں نہ لوں گی۔لوگ مجھ پر گھوریں گے،میں نمایاں ہو جاؤں گی،اس کی بہ نسبت میں مجمع میں چھپ جاؤں گی جب کبھی باہر نکلوں گی،میرے دوست کیا کہیں گے جب وہ مجھے اس میں دیکھیں گے؟ یا اللہ میری مدد کر۔

میں تبدیلی کے کنارے پر کئی مہینوں تک کھڑی رہی،میرا ذہنی بحران ہر روز بڑھتا جا رہا تھا۔مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اپنی پرانی زندگی چھوڑ دوں اور ایک نئی زندگی شروع کروں۔لیکن میں واضح طور پر مجمع میں حجاب کے ساتھ نہیں جا سکوں گی۔لوگ مجھے گھوریں گے،میں اس شاخوں والے راستہ پر کھڑی تھی جہاں خدا نے مجھے اپنی مدد سے پہنچایا تھا۔میرے پاس نیا علم تھا،جو میری عقل کے ساتھ با آسانی مطابقت رکھتا تھا۔کیا میں اپنے ایمان کی پیروی کروں یا پرانی طرز پر قائم

رہوں؟ میں کیسے رہ سکتی ہوں جب کہ یہ قدم میرے لیے بہت بڑا ہے؟ میں دوبارہ پڑھوں گی، تبدیلی مذہب کے کلمات کو "کوئی خدا نہیں ہے مگر خدائے واحد" اور محمدؐ اس کے نبی ہیں" آسان الفاظ ہیں" اور میں ان میں یقین رکھتی ہوں اس وجہ سے میں اپنا مذہب تبدیل کر رہی ہوں۔ میں ایسا نہیں کرسکتی۔ میں مزاحمت کرتی ہوں۔ میں ایک کے بعد ایک دن چکر لگاتی رہی۔ خدا شاخوں والے راستہ کے ایک راستہ پر کھڑا تھا اپنا پاؤں زمین پر مارتے ہوئے آہستگی کے ساتھ۔۔۔۔!

کیتھی آجاؤ! میں تمہیں یہاں تک لایا ہوں مگر یہ راستہ تمہیں خود ہی عبور کرنا ہے تنہا اپنے طور پر۔ میں ساکت کھڑی رہی اس کینگرو کی مانند جو رات گاڑیوں کی روشنیوں میں ٹھٹکا ہوا پڑا ہو۔ پھر ایک رات شاید خدا ہی نے مجھے آخری زوردار جھٹکا دیا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک مسجد سے گزر رہی تھی مجھ میں ایک ایسا شدید احساس تھا کہ میں اس کو برداشت نہ کرسکی۔

اگر تم نے اب مذہب نہ بدلا تو تم کبھی ایسا نہ کرسکو گی۔ میرے اندر کی آواز نے مجھے بتایا۔ میں جانتی تھی کہ یہ سچ تھا۔ ٹھیک ہے میں ایسا کروں گی۔ اگر انہوں نے مجھے مسجد کے اندر آنے دیا میں ایسا کروں گی۔ مگر وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے کلمہ شہادت درختوں کے نیچے مسجد سے باہر پڑھا۔ میں نے انتظار کیا، میں نے انتظار کیا بجلی کے کسی کوندے کا میں نے انتظار کیا اطمینان کے فوری احساس کا، اپنے اوپر سے بوجھ ہٹ جانے کے احساس کا، مگر ایسا نہ ہوا۔ میں اب بھی پہلے جیسی ہی تھی۔ اب ہم دوبارہ جھکے ہوئے ہیں۔ دنیا یہاں نیچے سے بہت مختلف دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ مشہور فٹ بال کے کھلاڑی اس طرح زمین کے بل گرا کرتے ہیں۔ میں یاد کرتی ہوں، اپنے حجاب کی جھالر کے پھولوں کے اطراف کو دیکھتے ہوئے جو جائے نماز پر گر پڑتے ہیں۔ ہم سب ایک جیسے ہیں اور یکساں طور پر خدا کے آگے عاجزی کے ساتھ جھکے ہوئے۔ اب ہم سیدھے بیٹھ رہے ہیں۔ میری نماز کا امام اب بھی کچھ بول رہا ہے۔ اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کو ہوا میں لہراتے ہوئے میں دوبارہ اپنے مصلے کی طرف دیکھتی ہوں، سبز، کاسنی، اور سیاہ رنگ جو میرے مصلے پر ہیں، ناقابل یقین حد تک ویسے ہی ہیں۔ مسجد کی جانب راستہ کی سیاہی مجھ سے ملتجی ہوتی ہے "میں یہاں ہوں، بس تم خود کو مطمئن کرلو، تو تم مجھے پالوگی" میرے آنسو میرے چہرے

پر خشک ہو گئے ہیں اور جلد سخت محسوس ہوتی ہے۔میں یہاں کیا کر رہی ہوں؟ اے پیارے خدا میں یہاں اس لیے ہوں۔کیونکہ آپ پر یقین رکھتی ہوں، کیونکہ میں قرآن کے متاثر کن اور شاندار الفاظ میں ایمان رکھتی ہوں اور کیونکہ میں آپ کے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان رکھتی ہوں۔میں اپنے دل میں جانتی ہوں کہ میرا فیصلہ درست ہے۔مہربانی فرما کر آپ مجھے ہمت عطا فرمائیں کہ میں اپنی اس نئی ذات، اور زندگی کو لے کر آگے بڑھ سکوں، تا کہ میں مضبوط ایمان کے ساتھ آپ کی بہترین خدمت کر سکوں۔میں مسکراتی ہوں اور کھڑی ہو جاتی ہوں اپنے مصلے کو آدھا تہہ لگا کر، اور اسے صوفہ پر ڈال دیتی ہوں تا کہ اس کی سبز مخملی کیفیت سے میری اگلی ملاقات کی تیاری یقینی رہے۔بوجھ اترنا شروع ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

حضرت عامرؓ بن فُہیرہ

(طالب الہاشمی)

ابو عمرو عامرؓ بن فُہیرہ، امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے اخیافی بھائی طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے۔ وہ ظاہری صورت کے لحاظ سے ایک سیاہ فام حبشی تھے، لیکن ان کی جبلت کو مبداءِ فیض نے ایسے نورانی سانچے میں ڈھالا تھا کہ مکہ کے ظلمت کدہ میں جونہی رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے شمعِ توحید روشن کی، وہ اس شمع کے پروانے بن گئے اور حضورؐ کے دارِ ارقم میں تشریف لے جانے سے پہلے ہی دولتِ ایمان سے بہرہ یاب ہو گئے۔

مشرکین بھلا یہ کیونکر گوارا کر سکتے تھے کہ ایک بیکس غلام ان کے سامنے توحید کا دم بھرے۔ ان کے قہر و غضب کا طوفان پوری قوت سے حضرت عامرؓ پر پھٹ پڑا۔ کوئی ظلم ایسا نہ تھا جو ان بدبختوں نے اس مردِ حق پر نہ توڑا۔ کبھی انہیں بے دردی سے زدوکوب کرتے تھے کبھی گرم ریت اور کانٹوں پر گھسیٹتے تھے۔ عامرؓ اگرچہ نحیف الجثہ تھے، لیکن ان کے سینے میں فولاد کا دل تھا۔ انہوں نے نہایت ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ تمام مصیبتیں برداشت کیں اور ایک لحہ کے لیے بھی ان کے قدم جادہ حق سے نہ ڈگمگائے۔ اتفاق سے ایک دن سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں اس حال میں دیکھ لیا کہ کفار انہیں کانٹے چبھو رہے تھے اور ان کی داڑھی پکڑ کر طمانچے مار رہے تھے۔ صدیق اکبرؓ سے ان کی مظلومی دیکھی نہ گئی اور انہوں نے اسی وقت انہیں خرید کر آزاد کر دیا۔ اب عامرؓ تھے اور آستانہ نبوی تھا۔ دن رات اسی دھن میں رہتے تھے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی خوشنودی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

ہجرت کے موقع پر رحمتِ عالم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ غارِ ثور میں رونق افروز ہوئے تو صدیقِ اکبرؓ کے اہلِ خانہ کے علاوہ حضرت عامرؓ بن فُہیرہ بھی اس پرخطر راز سے آگاہ تھے۔ گویا سرورِ عالم ﷺ اور صدیقِ اکبرؓ کے نزدیک وہ ایک ایسی شخصیت تھے جن پر ہر حال میں مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عامرؓ بن فُہیرہ دن بھر (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی) بکریاں چراتے تھے اور شام کو انہیں غار کے منہ پر لے آتے تھے۔ یہاں ان کا دودھ دوہ کر سرکارِ دوعالم ﷺ اور صدیقِ اکبرؓ کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

تین شب وروز کے بعد جب کائناتِ ارضی وسماوی کی یہ مقدس ترین ہستیاں غارِ ثور سے روانہ ہونے لگیں تو حضرت عامرؓ بن فُہیرہ بھی ان کے ہمرکاب ہوگئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں اپنے اونٹ کے پیچھے بٹھالیا اور یوں سفرِ ہجرت میں انہیں اپنے آقا ومولاؐ کی معیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ابنِ سعدؒ کا بیان ہے کہ جب اس مقدس قافلے نے قُباء میں نزولِ اجلال فرمایا تو حضرت عامرؓ بن فہیرہ کو حضرت سعدؓ بن خیثمہ انصاری نے اپنا مہمان بنایا۔

ورودِ مدینہ کے چند ماہ بعد حضورؐ نے مہاجرین اور انصار کے مابین مواخاۃ قائم کرائی تو حضرت عامرؓ بن فہیرہ کو حضرت حارثؓ بن اوس کا اسلامی بھائی بنایا۔

مکہ اور مدینہ کی آب وہوا میں بہت فرق تھا اس لیے مکہ سے آنے والے مہاجرین کو شروع شروع میں مدینہ کی آب وہوا راس نہ آئی اور ان میں سے بعض اصحاب علیل ہوگئے۔ حضرت عامرؓ بن فہیرہ بھی ان میں شامل تھے۔ ان کی علالت نے اتنی شدت اختیار کی کہ زندگی سے مایوس ہوگئے۔ اس حالت میں بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔

انی وجدتُ الموت قبل ذوقہٖ
ان الجبانَ حتفہ من فوقہٖ
کل امرءٍ مجاھدٌ بطوقہٖ
کالثور یحمی اَنْفَہٗ بروقہٖ

(میں نے موت سے پہلے ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا۔ بے شک بزدل کی موت اس کے اوپر سے ہے۔ ہر شخص اپنی طاقت کے مطابق کوشش کرتا ہے۔ جس طرح بیل اپنے سینگ سے اپنی ناک کی حفاظت کرتا ہے۔)

صحیح بخاری میں ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاجرین کی علالت کی خبر ہوئی تو آپ نے دعا فرمائی: ”الٰہی تو مکہ کی طرح یا اس سے بھی زیادہ مدینہ کو ہمارے لیے خوشگوار بنادے اور اس کو بیماریوں سے پاک وصاف کردے۔“

محبوب رب العالمینؐ کی دعا قبول ہوئی، مہاجرین صحت یاب ہوگئے اور حضرت عامرؓ بن فہیرہ بھی بسترِ علالت سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

حضرت عامرؓ بن فہیرہ اخلاص فی الدین، زُہد واتقا، شغفِ قرآن اور حُبِّ رسول کے اعتبار سے ایک مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ انوارِ رسالت کی تجلیوں نے ان کے قلب ودماغ کو ایسا منور کیا تھا کہ خاصانِ خدا میں شامل ہوگئے تھے۔ رحمتِ دوعالم ﷺ سے والہانہ محبت اور عقیدت تھی

اور آپؐ کے معمولی اشارے پر اپنی جان راہِ حق میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ رمضان المبارک ۲ھ ہجری میں حق وباطل کا معرکہ اول بدر کے میدان میں پیش آیا تو حضرت عامرؓ بن فہیرہ اس میں بڑے ذوق وشوق سے شریک ہوئے اور پرستاران باطل کے خلاف خوب خوب دادِ شجاعت دی۔

اگلے سال غزوہ اُحد میں بھی رحمت عالمﷺ کی ہمرکابی کا شرف حاصل کیا اور بڑی بہادری سے لڑے۔ صفر ۴ھ ہجری میں سرورِ عالمﷺ نے ابو براء کلابی کی استدعا پر ستر صحابہؓ کی ایک جماعت نجد کی طرف روانہ فرمائی۔ اس جماعت کے اکثر اراکین اصحاب صُفّہ میں سے تھے اور قُراء (قرآن پڑھنے والے) کے لقب سے مشہور تھے۔ حضرت عامرؓ بن فُہیرہ بھی اس مقدس جماعت میں شامل تھے۔ جب یہ اصحاب بیئر معونہ کے مقام پر پہنچے تو بنو کلاب کے سردار عامر بن طفیل نے غداری کی اور قبائل رعل وذکوان کے مشرکین کو ساتھ لے کر ان پاکباز اصحاب پر حملہ کر دیا جو ان کو ہدایت اور نجات کا راستہ بتانے آئے تھے۔

یہ تمام مردانِ حق حضرت عمروؓ بن امیہ الضمری کے سوا مشرکین کی تیغ جفا کا شکار ہوگئے اور خلعتِ شہادت پہن کر خلد بریں میں پہنچ گئے۔ حضرت عامرؓ بن فہیرہ کو ایک شخص جبار بن سلمٰی کلابی نے شہید کیا۔ جب اس نے پوری قوت سے اپنا نیزہ حضرت عامرؓ کی پشت پر مارا تو انہوں نے گرتے ہوئے بے ساختہ فرمایا "**فُزْتُ واللّٰہ** "(خدا کی قسم میں کامیاب ہوگیا) اس وقت حضرت عامرؓ بن فہیرہ کی لاش تڑپ کر آسمان کی طرف بلند ہوئی اور نظروں سے غائب ہوگئی۔ جبار بن سلمٰی کو یہ نظارہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی اور کفر کی تاریکی اس کے نہاں خانہ باطن سے کافور ہوگئی۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ جبار بن سلمٰی اسی واقعہ سے متاثر ہوکر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری کو مشرکین نے زندہ گرفتار کرلیا اور پھر عامر بن طفیل نے اپنی ماں کی ایک منت پوری کرنے کے لیے انہیں رہا کر دیا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر صحابہ کے مقتل کی طرف گیا اور ایک لاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضرت عمروؓ بن امیہ نے جواب دیا: "عامرؓ بن فہیرہ"۔ عامر بن طفیل نے کہا کہ میں نے ان کو قتل ہونے کے بعد دیکھا کہ آسمان کی طرف اٹھا لیے گئے یہاں تک کہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق نظر آئے پھر ان کی لاش کو زمین پر رکھ دیا گیا۔

"اُسدُ الغابہ" میں حضرت عروہؓ کا یہ بیان درج ہے کہ شہداء بئر معونہ میں حضرت عامرؓ بن

فہیرہ کی نعش تلاش کی گئی تو نہیں ملی۔ اس پر لوگوں نے خیال کیا کہ ان کی نعش کو فرشتے اٹھا کر لئے گئے۔ سرورِ عالم ﷺ کو اس المناک واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ کو سخت صدمہ ہوا اور آپؐ چالیس دن تک نمازِ فجر کے بعد قاتلوں کے لیے بدعا کرتے رہے۔

ایک روایت میں ہے کہ واقعہ شہادت کے بعد عامر بن طفیل کلابی نے حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری سے پوچھا کہ کیا تو اپنے تمام ساتھیوں کو پہچانتا ہے۔ انہوں نے کہا، ہاں سب کو جانتا ہوں۔ چنانچہ عامر بن طفیل حضرت عمروؓ کو ساتھ لے کر شہداء کی لاشوں کے درمیان پھرنے لگا۔ وہ حضرت عمروؓ سے ہر ایک شہید کا نام و نسب دریافت کرتا جاتا تھا۔ جب سب لاشوں کا نام و نسب دریافت کر چکا تو حضرت عمروؓ سے پوچھا، ان میں کوئی کم ہے یا سب کی لاشیں موجود ہیں۔

حضرت عمروؓ نے فرمایا، ان میں عامرؓ بن فہیرہ نہیں ہیں۔ عامر بن طفیل نے پوچھا: تم لوگوں میں وہ کیسا شخص تھا؟ حضرت عمروؓ بن امیہ نے فرمایا: وہ ہم لوگوں میں سب سے افضل اور ہمارے نبی کریم ﷺ کے اولین صحابہ میں سے تھے۔

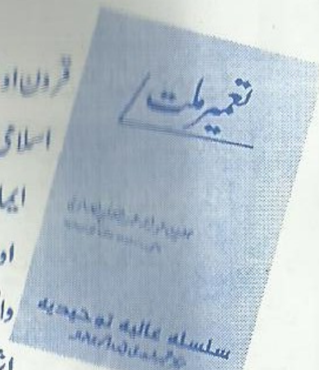
یہ سن کر عامر بن طفیل نے جبار بن سلمی کلابی کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے اس کو نیزے کی ضرب لگائی، جب نیزے کو جسم سے کھینچا تو ایک شخص مقتول کو اٹھا کر آسمان کی طرف لے گیا۔ اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا۔ حضرت عمروؓ بن اُمیہ فوراً پکار اٹھے **ذلك عامرؓ بن فهيره** (وہ عامرؓ بن فہیرہ ہی تھے اور وہ ایسے ہی شخص تھے۔)

جبار بن سلمی کلابی قاتل عامرؓ بن فہیرہ سے روایت ہے کہ جب میں نے عامرؓ بن فہیرہ کو نیزہ مارا تو انہوں نے کہا **فُزت واللّٰہ** میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ایسا کہنے سے ان کی کیا مراد ہے۔ چنانچہ میں ضحاکؓ بن سفیان کلابی کے پاس گیا جو رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بنو کلاب کے عامل تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "**فُزت واللّٰہ**" کہنے سے مقتول کی کیا مراد تھی۔ ضحاکؓ نے کہا کہ ان کی مراد تھی، اس طرح شہادت پانے سے مجھے جنت مل گئی (اور میں اپنے مقصدِ زندگی میں کامیاب ہو گیا۔) پھر ضحاکؓ نے مجھے دعوتِ اسلام دی تو میں نے اسلام قبول کرنے کا اقرار کیا، لیکن میرے قبول اسلام کا اصل سبب وہ ماجرا ہے جو میں نے عامرؓ بن فہیرہ کی شہادت کے بعد اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

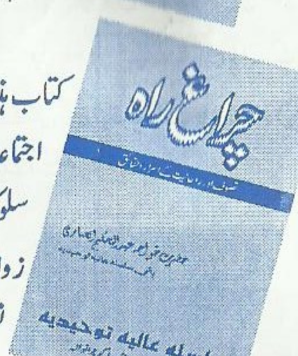
شہادت کے وقت حضرت عامرؓ بن فہیرہ کی عمر بہ اختلافِ روایت ۳۴ برس یا چالیس برس کی تھی۔ انہوں نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

☆☆☆☆☆

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف



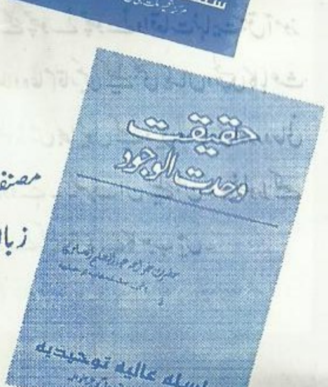
قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق و آداب کے اسرار و رموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے ۲۰ سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

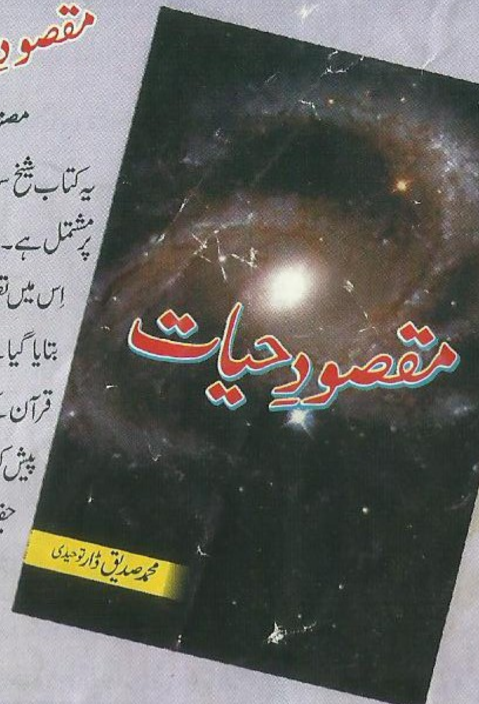


یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔

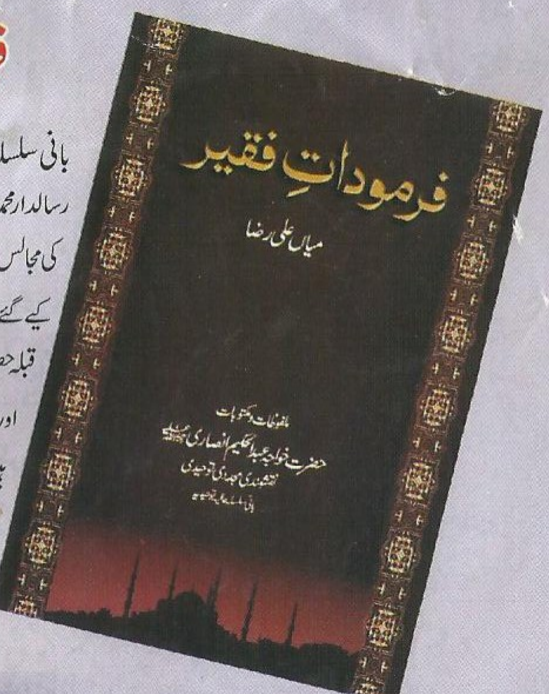
مکتبہ توحیدیہ کی مطبوعات



مقصودِ حیات

مصنف: محمد صدیق ڈار توحیدی (شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ)

یہ کتاب شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ قبلہ محمد صدیق ڈار صاحب کے سالانہ خطبات پر مشتمل ہے۔ جو انہوں نے سلسلہ توحیدیہ کے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے۔ اس میں تصوف کی تعلیمات کو قرآن کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ تصوف اسلام اور قرآن سے باہر کی کوئی چیز نہیں بلکہ یہ عین قرآن کے احکامات کا نام ہے اور قرآن جس طرح کے بندہ مومن کی تصویر پیش کرتا ہے وہ بلاشبہ ایک سچے صوفی کا ہی روپ ہے۔ قرآن پاک کے حقیقی پیغام کو آسان پیرائے میں سمجھنے کیلئے یہ کتاب سالکانِ راہ حق کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔



فرموداتِ فقیر

مرتب: میاں علی رضا

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ، خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ اور آپکے دوست اور محسن رسالدار محمد حنیف خانؒ کی سوانح حیات کیساتھ اس کتاب میں قبلہ انصاری صاحبؒ کی مجالس کا تذکرہ اور اپنے مریدوں کو مختلف اوقات میں لکھے ہوئے خطوط شامل کیے گئے ہیں۔

قبلہ حضرت کی مجالس میں بیان کیے گئے چھوٹے چھوٹے واقعات نہایت سبق آموز اور راہ سلوک کے مسافروں کے علاوہ عام قارئین کیلئے بھی یکساں دلچسپی کا باعث ہیں۔ آپکے لکھے ہوئے جوابی خطوط میں بھائیوں کیلئے دینی و دنیاوی اور روحانی مشکلات کے حل کا سامان موجود ہے۔ نہ صرف ان کیلئے جن کو یہ خطوط لکھے گئے بلکہ اب بھی ہر پڑھنے والے کیلئے فائدے کا سبب ہیں۔

Reg: SR - 01
Website: www.toheedia.net